(شمارهٔ مسلسل ۱۸)

جلد ۵ نمبر ۲

فکر و نظر

اپریل ۱۹۶٤

مدیر

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

قیمت سالانہ دس روپیے (علاوہ محصول ڈاک)
قیمت فی پرچہ ڈھائی روپیے (علاوہ محصول ڈاک)

فکر و نظر کے سلسلے کی ساری خط و کتابت ڈاکٹر نذیر احمد، صدر شعبۂ فارسی و سکریٹری ادارۂ فکر و نظر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پتے پر کی جائے

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحات
۱	ادب میں اخلاقی اقدار کا تصور	جناب طیب عثمانی ندوی	۱
۲	ماضی تمام کے تین صیغے	سونیا چیرنی کووا صاحبہ	۱۸
۳	اقبال کا تصور تعلیم	ڈاکٹر غلام عمر خاں	۴۹
۴	جدید ترکی ادب	ڈاکٹر اکمل ایوبی	۷۸
۵	ادب میں شخصیت	جناب شمس الرحمن فاروقی	۸۸
۶	ایم ۔ اے ۔ او کالج سے متعلق غیر مطبوعہ خطوط (انگریزی)	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۱۹۳-۲۵۰

ادب میں اخلاقی اقدار کا تصور

از

جناب طیب عثمانی (ندوی)

«ادب تنقید حیات ہے» اس قول کی صداقت سے آج کا کوئی نقاد شاید ہی انکار کرسکے، لیکن حیات کا تصور اب محدود اور منفرد نہیں ہے بلکہ اس کا پھیلاؤ خاندان اور سماج سے بڑھ کر پوری انسانیت تک وسیع ہوگیا ہے۔ اس اسپتنک دور میں جب کہ انسان خلاؤں کو تسخیر کررہا ہے، ستاروں پر اپنی کمندیں پھینک رہا ہے اور اس کی نگاہیں کائنات کی وسعتوں میں پھیل رہی ہیں، ایسی صورت میں زندگی کا کوئی محدود تصور ممکن نہیں ہے۔ حیات کا یہ بحر بیکراں جو ایک طرف اگر حسن و تابش اور لطافت و جمال سے بھرپور ہے تو ساتھ ہی فکرونظر کے لئے عقل و دانش اور رعنائی خیال کے گہرہائے آبدار سے مالامال ہے۔ آج کا ادیب و شاعر جو حیات کا رازداں اور اس کے اسرار سربستہ کا پردہ کشا ہے، اس کی انفرادی زندگی کی اہمیت اور اس کے ذاتی احساسات و جذبات کی قدر و منزلت کے باوجود اس کا اجتماعی شعور حیات و کائنات کی وسعتوں میں پھیلا ہوا ہے، اس لئے آج کے ادب کو انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی خواہشات، صحت مند تصورات اور انسانی اقدار کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔

اس سائنسی دور میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث بےکار و بےمعنی ہوکر رہ گئی ہے، اس لئے کہ زندگی کا تصور اتنا وسیع، رنگارنگ اور متنوع ہے کہ کوئی ادب جو حقیقتاً زندگی آمیز اور زندگی آموز ہوگا اس پر ہماری موجودہ زندگی کی پرچھائیں ضرور پڑے گی۔ آج کا کوئی ادیب و شاعر اپنے سماجی ماحول، معاشی محرکات، سیاسی حالات، مذہبی عقاید اور تہذیبی رجحانات سے علیحدہ نہیں ہوسکتا، اس کے گہرے اثرات ضرور مترتب ہوتے ہیں اور ہمارا ادب بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ کوئی ادیب و شاعر بے مقصد نہیں لکھتا۔ جب تک اس کے پاس کچھ کہنے کو نہ ہو، یوں ہی قلم کاغذ لیکر

صفحۂ قرطاس پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں نہیں کھینچتا تاکہ خود بخود کوئی حسین پھول یا خوبصورت نقش و نگار اُبھرآئے ، بلکہ جس وقت اس کے ہاتھ میں قلم آتا ہے اس سے پہلے اس کے ذھنی شعور پر اس کے تخلیقی نقوش اُبھر آتے ہیں ۔ ان نقوش کو نظم ، افسانہ یا غزل کی صورت میں وہ صفحۂ قرطاس پر دائمی اور پائدار نقش عطا کرتا ہے اور یہی ایک سچے اور حقیقی ادیب و شاعر کا وہ تخلیقی عمل ہے جو اسے ثبات و دوام بخشتا ہے ۔ اس کا یہ باشعور تخلیقی عمل اس کے اندر احساس ذمہداری پیدا کرتا ہے ۔ جہاں وہ اپنے جذبہ اور احساس سے متاثر ہوتا ہے ، وہاں ساتھ ھی اس کے اندر سماجی احساس ، ذھنی عقیدہ اور تہذیبی رجحانات بھی رہتے ھیں اور وہ ان کو نظرانداز نہیں کرتا ۔ یہ بات کسی طرح بھی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ کوئی ادیب یا شاعر جب لکھنے بیٹھے تو وہ اس کا تو اہتمام کرے کہ کوئی لفظ غلط نہ استعمال ہو ، محاورے صحیح ہوں ، اسلوب بیان اور طرز ادا میں جدت و ندرت ہو اور اس کی تخلیق اعلیٰ فن کی آئینہدار ہو ، لیکن جو بات اسے کہنی ہے اس کی طرف اس کا ذہن بھی نہ گیا ہو ، وہ بے سوچے سمجھے اور بےمقصد قلم لے کر لکھنے بیٹھ گیا ہو ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ادیب و شاعر کی حیثیت اس کے ادیب و شاعر ہونے سے پہلے ایک ذمہدار انسان کی ہے ۔ وہ کوئی بات ایسی نہیں کہہ سکتا جو اسکی ذمہدارانہ حیثیت کے منافی ہو ۔ خیال و معنی ، حرف و صوت سے زیادہ اھمیت رکھتے ھیں ۔ الفاظ کی بامعنی ترتیب کا مقصد ھی حقیقتاً خیال کی شمعیں روشن کرتا ہے ۔ شاعر و ادیب کی یہی وہ ذمہدارانہ حیثیت ہے جو اسے بے مہار ہر طرف منہ مار لینے اور جو چاہا کہدینے سے روکتی ہے ۔ ایک باشعور فنکار اپنے ذہن میں زندگی کا ایک وسیع تصور رکھتا ہے اور یہی تصور اسے ایک مقصد کا پابند بناتا ہے ۔ آج کے دور میں وہ مقصد انفرادی سے زیادہ اجتماعی ہوگا اور کوئی باشعور فنکار اپنے اجتماعی مقصد کو نظرانداز نہیں کرسکتا ۔

ادب اور زندگی کی اس آمیزش اور سماج میں اس کی اھمیت کے اعتراف و تائید کے باوجود مارکسی نقادوں کی طرح ادب کے اس مادی تصور کے ھم قائل نہیں ھیں جہاں تمام سماجی محرکات اور تہذیبی رجحانات اس دور کے معاشی عوامل کے ساتھ وابستہ ھیں ۔ تاریخ اور سماج کا یہ یکطرفہ مطالعہ ہے کہ « خیالات[1] اور ان کے فنی مظاھر بھی انسان کی

---

۱ ادب کا مادی تصور ــ از احتشام حسین

مادی زندگی کے عروج و زوال سے تعلق رکھتے ہیں» - اور یہ کہنا بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ «کسی قسم[1] کی مادی بنیاد کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے شعر و ادب کی دنیا اکثر و بیشتر خواب و خیال کی دنیا سمجھی گئی ہے جس کی نہ راہیں متعین ہیں اور نہ سمت مقرر ہے» - اور یہ بھی تاریخ کی غلط تعبیر ہی کا نتیجہ ہے کہ «انسان[2] کا مادی وجود اس کے شعور کا تعین کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہن حقیقتوں کا خالق نہیں ہے بلکہ مادی حقایق خود ذہن کی تخلیق کرتے ہیں» اس طرح خیال اور شعور کی حیثیت بھی مادی ہوجاتی ہے - اور ذہن و فکر کی یہ ایک ایسی گمراہی ہے جس نے پورے سماجی نظام کو درہم برہم کررکھا ہے - اگر ادب میں بھی یہ مادی تصور تسلیم کرلیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا تمام ادبی ورثہ ایک دفتر پارینہ بن کر رہ جائے - کالی‌داس کے ڈرامے، دانتے اور ملٹن کی شاعری، فردوسی کا شاہنامہ اور اقبال کی پیمبرانہ شاعری کی عظمت کیا باقی رہے گی ؟ یہ مختلف دور کے فنکار اگر صرف اپنے دور کے معاشی محرکات کے پروردہ ہوتے تو ان کے تخلیقی عمل میں آج ہم جو دائمی حسن، ابدی صداقت اور لازوال حسن پاتے ہیں، وہ کبھی نہیں پاسکتے تھے -

مارکس کا یہ مادی تصور ایک ایسا انتہا پسندانہ نقطۂ نظر ہے جس نے خالص حیوانی عناصر کو انسانی تہذیب و تمدن اور ادب و فن کی بنیاد قرار دیا ہے - ہمارے مارکسی نقاد زندگی کی اس مادی توجیہہ کو زندگی کے دوسرے تمام محرکات اور عوامل پر ترجیح دیتے ہیں - ان کے نزدیک زندگی کی اساسی اور حقیقی قدریں صرف مادی اور معاشی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مادہ اور معاش سے انسانی اعمال و کردار کی پوری تشریح و تعبیر نہیں ہوتی - انسان صرف «پیٹ» کا نام نہیں ہے، انسان مختلف جذبے، محرکات اور عوامل کا مجموعہ ہے - قدرت نے اسے پیٹ کے ساتھہ دل اور دماغ بھی بخشے ہیں، جنسی میلان بھی دیا ہے اور اسے کچھہ ایسی آرزوئیں اور خواہشیں بھی عطا کی ہیں جو بھوک اور پیٹ سے بالاتر ہیں - زندگی کی اہم اور قیمتی قدریں وہی ہیں جن سے ہمارے دل و دماغ کو تشفی حاصل ہوتی ہو اور ہماری روح تسکین پاتی ہو، غذا کی ضرورت ہماری ان روحانی قدروں کا وسیلہ اور ذریعہ ہے مقصد نہیں -

جھوٹی ہے ہر ایک مسرت روح اگر تسکین نہ پائے

۱، ۲ - ادب کا مادی تصور از احتشام حسین-

زندگی کا یہ مادی تصور در اصل ایک تہذیب نا آشنا اور یک رخے ذہن کی پیداوار ہے جو صرف جذبات و احساسات کی موجودگی کو کسی حقیقت کے ادراک کے لئے کافی سمجھتا ہے ۔ حالانکہ ایک باشعور اور مہذب ذہن ہمیشہ حیات و کائنات کی ان رفعتوں کا جویا رہتا ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں ۔ زندگی کی سطحی واقفیت سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ۔ اسی لئے وہ انسانی « کل » پر نگاہ رکھتا ہے، انسان کا جزئی حسن اس کی نگاہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ وہ حیات و کائنات کی تمام بکھری ہوئی صداقتوں کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کرتا ہے۔ حیات کے اجتماعی حسن پر اس کی نگاہ رہتی ہے اور وہ ان کو اکٹھا دیکھنے کا آرزومند رہتا ہے ۔ اس کی نگاہ اس حقیقی مرکز کو پانا چاہتی ہے جسکے گرد کائنات کی ساری اشیاء گھوم رہی ہیں ۔ وہ زندگی کے صرف اوپری خول کو نہیں دیکھتا بلکہ اسرار حیات کی پردہ کشائی اور اس کی حقیقتوں تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے ۔

زندگی کا یہ ہمہ گیر تصور ہمیں حیات و کائنات کے مجموعی مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے ۔ اس کائنات کی سب سے اہم تخلیق انسان ہے ۔ انسان کا حقیقی اور صحیح مطالعہ ہی کائنات اور اس کی حقیقتوں کو سمجھنے میں مدد و معاون ہو سکتا ہے ۔ زندگی کا یہ مادی تصور بھی دراصل انسان کی صرف ایک جبلت (Instinct) غذا کی جستجو کو سب کچھ سمجھ لینے کا نتیجہ ہے . حالانکہ انسانی نفسیات پر جب ہم ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں مختلف انسانی جبلتیں صاف دکھائی دیتی ہیں . جنسی خواہش اور بھوک کی جبلت کے علاوہ انسان کی ایک دوسری اہم جبلت اس کی جمال پسندی کی جبلت (Aesthetic Instinct) بھی ہے ۔ ادب ، آرٹ ، شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ انسان کی اسی جبلت جمال پسندی کی مرہون منت ہیں ۔ یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ ادب و فن کی تخلیق میں صرف معاشی اور جنسی جبلتوں ہی کی کار فرمائی رہتی ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ حقیقتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں ورنہ ادبیات عالم میں کسی اعلی ادب و فن کی تخلیق کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا ۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ انسانی وجود جہاں گوشت و پوست سے مرکب ہے وہاں اس کا اپنا ایک روحانی وجود بھی ہے۔ انسان کا اندرون اس کے بیرون سے زیادہ حقیقی ، وسیع ، روشن اور تابناک ہے ۔ انسانی جبلتوں کی کار فرمائی میں اس کا اندرون زیادہ اثر انداز ہوتا ہے ، انسان کی جمال پسندی

کی جبلت حقیقتاً اس کے اندرونی اور روحانی وجود کی آئینہ دار ہے جو انسانی اعمال و افعال کا سب سے بڑا اور موثر ترین محرک ہے۔ اعلیٰ ادب و شاعری کی تخلیق میں تمام تر انسان کی اسی جبلت کی کارفرمائی رہتی ہے۔ بھوک اور جنس کی جبلت انسان کے روحانی وجود جمال پسندی کی جبلت کی تابع رہتی ہیں جب کبھی بھی انسان کا روحانی وجود اس کے جنسی یا معاشی وجود کے تابع ہوجاتا ہے تو اس سے اعلیٰ ادب اور اعلیٰ فن کی تخلیق نہیں ہوتی۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں اس حقیقت کی بڑی اچھی نشاندھی کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> «بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن اس کے غلط ہونے کا امکان ذرا کم ہی ہے کہ جس شاعر کا جیسا تصور عورت کا ہوگا، کم و بیش ویسا ہی تصور اس کا خدا اور انسان کا ہوگا۔ میں نے آج تک کسی بڑی شاعری یا بڑے شاعر کے یہاں یہ نہ دیکھا کہ اس کا عورت کا تصور معمولی یا ادنیٰ درجہ کا ہو۔ انسان کی عظمت کا قائل خدا کی عظمت کا قائل ہوے بغیر نہیں رہ سکتا»۔

رشید صاحب نے انسان اور فن کی عظمت کے ساتھہ خدا کی عظمت کی بھی بات کی ہے۔ یہ دراصل انسان کی اسی حقیقی اور موثر ترین جبلت کا اظہار ہے، جو انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہے، یعنی ایک معبود کی تلاش جسے ہم «ذوق عبودیت» سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ انسان کی یہ بنیادی اور قوی تر جبلت ہی ہمارے ادب و فن کا بھی سرچشمہ ہے۔ ہر عظیم ادب کا سوتا کسی نہ کسی عظیم تصور ہی سے پھوٹتا ہے اور حیات و کائنات کا سب سے عظیم تصور خدا کا تصور ہے اس لئے تصور خدا کے بغیر اعلیٰ شعر و ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ یوں بھی کائنات کے تخلیقی عمل پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت درخشاں نظر آئے گی کہ فطرت کے اعلیٰ حسن اور اس کی تخلیق میں خدا کی قوت تخلیق کار فرما ہے۔ اس طرح آرٹ کی اعلیٰ تخلیق میں، وہ خواہ شاعری ہو یا مصوری، رقص ہو یا موسیقی، انسان اور خدا دونوں ہی شریک نظر آتے ہیں، اقبال نے سچ کہا ہے: ع سفال آفریدی ایاغ آفریدم

فطرت کا وجود خواہ وہ سنگ و آہن کی شکل میں ہو یا مادۂ سیال اور دھاتوں کے روپ میں، یہ سب براہ راست خدا کی قوت تخلیق کے مرہون منت ہیں اور ان سے صناعت و فن

کی تخلیق میں انسانی شعور و عمل کا دخل ہے۔ فطرت کے اعلی شاہکار سے انسانی فن کے شاہکار وجود میں آتے ہیں۔ خاک و آب اور سنگ و آہن خدا کی تخلیق ہیں ۔ اسپین کے خدا پرست فنکاروں نے ان سے مسجد قرطبہ اور قصر الحمرا کو وجود بخشا اور اس «حرم قرطبہ» کے جلال و جمال میں حکیم مشرق اقبال کو کئی «مرد خدا» کے جلال و جمال کی تصویر نظر آئی، جس سے متاثر ہوکر اقبال نے زندۂ جاوید نظم کی تخلیق کی ۔ کائنات میں حسن کے یہ لازوال جلوے خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ شاعر کی نگاہیں اسے جب دیکھتی ہیں، تو اس سے اس کا جذبہ احساس ابھر آتا ہے اور پھر حسین شاعری کے وجود سے ہمارے ادب و فن میں ایک نیا اضافہ ہوتا ہے۔ ورڈس ورتھ کے لئے لوسی کی معصومیت ، گل داؤدی کا رقص ، جنگل میں بیری توڑنے کا تجربہ، فصل کاٹنے والی کا گانا ، ویسٹ منسٹر برج کے اوپر سے لندن کا پر فضا منظر اور صبح کا پرسکون و خموش حسن ، یہ سب حسن فطرت کے جلوۂ صد رنگ تھے ، جنہیں شاعر نے دیکھا اور متاثر ہوا اور پھر اس کی جمال پسندی کی جبلت نے اس سے حسین اشعار کی تخلیق کرائی ۔

اختر اورینوی نے یہ کہہکر بڑی صداقت کا اظہار کیا ہے کہ «آرٹ کی تخلیق کے لئے ایمان شرط ہے، خواہ یہ ایمان ذرے پر ، ستارے پر ، پھول پر ، یا حسین آنکھوں پر ، شراب طہور پر یا آب انگور پر ، خودی پر یا خدا پر» گویا ایمان و یقین آرٹ کی تخلیق کے لئے لازمی شرط ہے۔ سوال پھر وہی ادنی اور اعلی آرٹ کا آجاتا ہے ، زندگی کے اعلی تصور پر یقین سے اعلی ادب کا وجود ہوگا اور زندگی کے ادنی تصور سے ادنی ادب کی تخلیق ہوگی ۔ ذرہ اور ستارے ، حسین آنکھوں اور آب انگور پر یقین سے اس اعلی شاہکار کی تخلیق ممکن نہیں جو خودی اور خدا پر یقین سے وجود میں آتی ہے۔

حیات و کائنات اور ادب و فن کے اس طویل تجزیہ کا مقصود یہ ہے کہ ہم ادب میں ان اخلاقی اقدار کے تصور کا کھوج لگائیں جو ادب کو اس کے مادی تصور سے بلند و بالا کرکے اعلی ادب و فن کی تخلیق میں معاون ہو۔ آج کی دنیا میں ادب کا مقصد جہاں تنقید حیات ہے وہیں فرد اور سماج کی تعمیر و تطہیر بھی ہے اور ادب کے روے تاباں پر صحت مند اور صالح حیات کی سرخی ہی اسے زندہ ، پایندہ اور تابندہ بناتی ہے ۔ اس لئے ادبی اقدار اور اخلاقی اقدار میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ آرٹ کا سرچشمہ انسان

کی جمالیاتی جبلت ہے اور اخلاق کا منبع بھی انسان کی وہ اندرونی صالح فطرت ہے جو خیر و شر، معروف و منکر کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے اور اس کی اصل مذہب ہے۔ اس طرح آرٹ اور مذہب دونوں کا بنیادی حقیقی تعلق انسانی ضمیر و وجدان سے ہے اور دونوں انسان کی اس لازوال جمال‌پسندانہ جبلت سے فیضیاب ہوتے ہیں جن سے انسان کا اندروں روشن و تابناک ہے۔ مذہب کی وہ عظیم صداقتیں جو ابتداے آفرینش سے آج تک ابدی اور دائمی ہیں، مثلاً صداقت، عدالت، امانت، دیانت، خدمت، شرم و حیا اور عفت وغیرہ یہی وہ اخلاقی اقدار بھی ہیں جن‌کا تعلق انسانی ضمیر و وجدان سے ہے۔ اس طرح اگر بنظر غایر دیکھا جائے تو حسن و جمال ہی مذہب و اخلاق اور ادب و فن کی بنیادی قدر ہے۔ ادبی اقدار اور اخلاقی اقدار دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ ان دونوں کی ہم آہنگی ہی سے اعلیٰ شعر و ادب کی تخلیق ممکن ہے۔ انسان اور انسانی معاشرہ کی تہذیب و تطہیر کا جذبہ ہی کسی عظیم فنکار کو اعلیٰ قسم کی تخلیق پر آمادہ کرتا ہے۔ انسانی اعمال پر اسکے اندرونی اخلاق کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے، انسان جس طرح خارجی دنیا کی تسخیر اور اس پر تصرف سائنس کی قوت اور ٹکنالوجی سے حاصل کرتا ہے، اسی طرح انسان کے اندرون پر اس‌کا اخلاقی نقطۂ نظر اثر انداز ہوتا ہے۔ اپنی تطہیر روح اور تہذیب نفس کا کام وہ اخلاق ہی کے ذریعہ لیتا ہے، اس طرح اخلاقی اقدار زندگی کی تعمیر و تطہیر اور اس کو حسین و پرمسرت بنانے میں بنیادی عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں، ادب میں ان اخلاقی اقدار کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انہیں کی بدولت زندگی کی شب تاریک کو روشنی نصیب ہوتی ہے، عقل کا چراغ رہ‌گذر آس پاس کی کچھ. زمین کو تو روشن کرسکتا ہے، لیکن انسان کے درون میں جو ہنگامے برپا ہیں اسے تو مذہب و اخلاق ہی کی روشنی سے دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ نیکی اور خیر کے اخلاقی اقدار انسان سے باہر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے بلکہ اس کی تمام‌تر تابانی خود اس‌کی قوت عمل میں مضمر ہوتی ہے۔ نیکی اور خیر کے یہ اخلاقی اقدار ہی انسانی عزایم کی تہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں جو افراد اور جماعتوں کو تخلیق مقاصد پر اکساتے رہتے ہیں اور یہی اعلیٰ مقاصد ایک اچھے ادیب و شاعر کو اعلیٰ ادب و فن کی تخلیق پر آمادہ کرتے ہیں۔ جب کوئی فن‌کار ان ادبی اقدار اور اخلاقی اقدار کو ہم آہنگی سے اپنے اندر سمو لیتا ہے تو اسکی مثال اس «ماہ نو» کی ہوجاتی ہے جس‌کے اندر «ماہ تمام» بننے کی پوری

صلاحتیں پوشیدہ رہتی ہیں اس طرح اس فنکار کی مخفی قوتوں اور اس سے اعلیٰ تخلیق کے امکانوں کی کوئی انتہا نہیں رہتی ۔

ادب میں اخلاقی اقدار کی اہمیت یوں بھی اور زیادہ ہوجاتی ہے جب اس مسئلہ کو ادبی سے زیادہ ہم عمرانی اور روحانی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں ۔ انسان اپنی روحانی ارتقا کے لئے جو بھی کوشش کرتا ہے اس میں اخلاقی توانائی کا ہونا ضروری ہے ۔ یہی اس کی تخلیقی قوتوں اور عملی طاقتوں کی محرک ہوتی ہے ۔ خوشی و مسرت اور سکون و طمانیت کے حسین لمحے انسان کو ہمیشہ اسی وقت میسر آتے ہیں جب اسکے چمن حیات پر اخلاقی عمل کی عطربیز ہوائیں اور خوشگوار جھونکے چلتے ہیں ۔ جس طرح موسم بہار میں باغوں میں پھول آتے ہیں اور مشام جاں کو معطر کرتے ہیں اسی طرح اخلاقی عمل انسانی زندگی کا کھلنا ہے جس سے سارا گلزار حیات لالہزار بن جاتا ہے اور زندگی اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کا اعلیٰ ترین اظہار کرتی ہے ، زندگی کے سوتے خشک نہیں ہوتے ان میں تازگی و شادابی سدا بہار رہتی ہے ۔

ادب میں جب اخلاقی اقدار کا ذکر آتا ہے تو ذہن خود بخود انسان کے جنسی جذبہ کی طرف منعطف ہوجاتا ہے ۔ میرے خیال میں ادب اور اخلاق دونوں کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ ایک ایسے نظام زندگی کا احیا کیا جائے جس میں گندگی، فحاشی، بے حیائی اور جنسی بے راہ روی نہ ہو ۔ عفت و عصمت کا تصور عام ہو، شرم و حیا عورت کے رخ تاباں کا غازہ ہو ، سماج میں شرافت، نیکی اور پاکدامنی ہو ، صحت مند جائز جنسی تعلقات آسان اور جنسی مزاج مشکل ہو ۔ ادب و اخلاق کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے سماج اور معاشرہ کے قیام کے لئے کوشاں ہو جس میں صحت مند جنسی تصور ہو اور مرد و عورت کی جنسی زندگی میں ایسا توازن برقرار رہے جس کی تلاش میں انسان آج تک سرگرداں ہے ۔

ادب میں فحاشی ، لذتیت اور جنسی ہیجان کے محرک ہمارے وہ ادباء و شعراء ہیں جو فرائڈ کے پیرو اور متبع ہیں ۔ مارکس کی طرح فرائڈ کا ذہن بھی یک رخے پن اور الجھاؤ کا شکار ہے ۔ جنس کی اس نفسیاتی الجھن کی جس نے فرائڈ کے ذہن کو پراگندہ کر رکھا تھا ، ایک عالم نفسیات نے بڑی خوبی سے وضاحت کی ہے ، وہ کہتے ہیں :

« جنس کو آفاقیت عطا کرنے کے باوجود فرائڈ کے حصے میں جو

کچھ آیا ہے وہ سر تا سر مجاز ہے - حقیقت تک اس کی رسائی نہیں ہوسکی ہے - وہ سمجھ نہیں سکا کہ ارتفاع جبلت (Sublimation) کی ایک اور بھی شکل ہے یعنی جبلت کا مجاز سے حقیقت کی طرف منتقل ہونا - تہذیب کی ترقی کے ساتھ انسانی جبلتیں اپنے اظہار کے لئے نئی وسعتیں اور راہیں تلاش کرتی رہتی ہیں، ایسی راہیں جو زیادہ مہذب، زیادہ وقیع اور زیادہ صحت مند ہوں، پھر انسانی دلچسپیاں صرف مادی اشیا تک محدود نہیں رہتیں بلکہ اسکے اشتیاق و طلب کا محور و مرکز ایک ایسی غیرمرئی ہستی بن جاتی ہے جو اس کارخانۂ عالم میں افادۂ فیضان کا سرچشمہ ہے »[1] -

اس طرح ہمارے نفس کا مقصود و منتہی جنس باقی نہیں رہتا اور نہ کوئی مادی شے رہتی ہے بلکہ ایک نفس مطلق جسے ہم معبود یا خدا کہتے ہیں ہمارا مقصود و منتہی بن سکتا ہے، جو حیات و کائنات کی تمام اصل حقیقتوں کا سرچشمہ ہے - میرے نزدیک جنس کا صحت‌مند اور صالح تصور وہ ہے جس کی وضاحت قرآن نے کی ہے - قرآن مجید کا کہنا ہے :

« اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہارے ہی جسم سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت و رحمت پیدا کردی - یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں » -

(سورہ ۳۰ رکوع ۲۱)

قرآن مجید کی اس وضاحت سے عورت اور جنس کا وہ اعلیٰ معیار ہمیں ملتا ہے جو جنسی زندگی کا مطلوب و مقصود ہے - قرآن اِس نفسیاتی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسانی روح کسی روح کی جویا رہتی ہے اور انسان کی فطرت میں ایک ایسے سکون کی طلب رکھدی گئی ہے جو ایک نفس کو دوسرے نفس سے ملتا ہے اور جو آپس میں فطری مناسبت اور مودت و رحمت کا جذبہ رکھتے ہیں - یہ قانون رفاقت فطرت کا ایک

---

۱ انسانی جبلتوں کا مطالعہ — از محمد فاروق خاں

عالمگیر قانون ہے ، جس سے کوئی نفس انسانی علیحدہ نہیں ہے - عورت و مرد کا رشتہ بڑا نازک اور لطیف رشتہ ہے - اِن کے وجود کا مقصد محض جنسی تسکین نہیں ہے بلکہ نفسیاتی اور روحانی اعتبار سے بھی دونوں ایک دوسرے کے دمساز و محرم راز ہیں - عورت، مرد کی صرف شریک حیات ہی نہیں بلکہ رفیق حیات بھی ہے - قدرت نے ایک دوسرے کو انس و محبت کا ذریعہ اور رفاقت کا سہارا بنایا ہے ، تاکہ اُنہیں کسی تنہائی کا احساس ستا نہ سکے اور اُن کی زندگیوں میں خوشی و مسرت اور سکون و طمانیت کے سدا بہار پھول کھلتے رہیں -

جنس کا یہ صحت مند تصور ہمارے اخلاقی اقدار کی ایک بنیادی قدر ہے - جو ادیب اور شاعر اس صحت‌مند جنسی تصور سے ہٹ‌کر مریضانہ جنسیت کے شکار ہیں اور اپنے ادب کو عریانی و فحاشی‌کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں، حقیقتاً وہ سماج میں بیماری پھیلانے اور ادب کے چشمۂ صافی کو گندلا کرنے کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں - ایسا ادب اچھا اور اعلیٰ ادب نہیں ہوسکتا، اس کا مٹا دینا ہی ہمارا فرض ہے - حقیقت نگاری کے سلسلہ میں عریانی کا اظہار کوئی صحت مند جذبہ نہیں، بلکہ یہ مریضانہ ذہن کی عکاسی ہے ، جس کا مقصد تعیش، لذت پرستی اور ہیجان کے سوا کچھ اور نہیں - حقیقت‌نگاری کے نام سے ادب میں جو گھناؤنا پن اور گندگی آئی ہے اس‌کے سد باب‌کے لئے ضروری ہے‌کہ ہم اپنے ادب کے لئے اُن اخلاقی اقدار کو نشان راہ بنائیں جن کی رہنمائی میں ادبی حقیقت نگاری فحش نگاری سے محفوظ رہے - قرآن مجید نے جس طرح جنس اور عورت کا صحت‌مند تصور پیش کیا ہے اسی طرح ادبی حقیقت نگاری کے سلسلہ میں بھی قرآن کا اپنا ادبی اسلوب ہے - ادبیات عالم میں حقیقت نگاری کا یہی ادبی اسلوب آج بھی معیار بن‌سکتا ہے - قرآن نے زندگی کی عریاں سے عریاں حقیقتوں کو ایسے اسلوب سے بیان کیا ہے کہ بات بھی پوری طرح سامنے آگئی ہے اور کہیں پر لذتیت اور فحش نگاری کی پرچھائیں نہ پڑسکی ہے - حضرت یوسف اور امرأۃ عزیز کا واقعہ اس سلسلہ میں واضح مثال ہے ، کتنے خوبصورت انداز میں اس نازک جنسی واقعہ کی عکاسی کی گئی ہے، جس میں لذتیت اور عریانی کا شائبہ نہیں بلکہ اس سے عبرت و نصیحت کی روح بیدار ہوجاتی ہے - قرآن کا یہ ادبی اسلوب اور سچی حقیقت نگاری ملاحظہ ہو -

«مصر میں جس شخص نے اسے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کو اچھی

طرح رکھنا ، بعید نہیں کہ ہمارے لئے مفید ثابت ہو ، یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لئے اس سر زمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اُسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا ۔ اللہ اپنا کام کرکے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اُسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا ، اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں۔ جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازہ بند کرکے بولی: «آجا» ۔ یوسف نے کہا: خدا کی پناہ ، میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں !)، ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے ۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا ، ایسا ہوا ، تاکہ ہم اس سے بدی اور بےحیائی کو دور کردیں ، درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ آخرکار یوسف اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف کی قمیص (کھینچ کر) پھاڑدی۔ دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا ، اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی : «کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری گھروالی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا سزا ہوسکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اُسے سخت عذاب دیا جائے» ۔ یوسف نے کہا: « یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کررہی تھی » : اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ اگر یوسف کی قمیض آگے سے پھٹی ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا ۔ جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو اس نے کہا ، یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں ، واقعی بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمہاری چالیں ، یوسف ! اس معاملے سے درگذر کر اور اے عورت ! تو اپنے قصور کی معافی مانگ تو ہی اصل میں خطا کار تھی۔

شہر کی عورتیں آپس میں چرچے کرنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے ، محبت نے اس کو بےقابو کررکھا ہے ، ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کررہی ہے ۔ اس نے جو یہ مکارانہ باتیں سنیں تو ان کو بلاوا بھیج دیا اور ان کے لئے تکیہ‌دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک ایک چھری رکھدی (پھر عین اس وقت جب کہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھی) اس نے یوسف

کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آئیں - جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور بے ساختہ پکار اٹھیں، حاشاللہ، یہ شخص انسان نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے - عزیز کی بیوی نے کہا: «دیکھ لیا! یہ ہے وہ شخص جسکے معاملہ میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں - بےشک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی، مگر یہ بچ نکلا - اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہوگا» یوسف نے کہا: اے میرے رب! قید مجھے منظور ہے، بہ نسبت اسکے کہ میں وہ کام کروں جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں اور اگر تونے ان کی چالوں کو مجھ سے نہ روکا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤنگا اور جاہلوں میں شامل ہوں گا - اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے دفع کردیں - بےشک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے -» (سورہ یوسف رکوع ۴۰۳ از تفہیم القرآن)

اسی طرح اور بھی جتنے واقعے اور تاریخی حقائق قرآن نے بیان کئے ہیں سب کی روح عبرت و نصیحت ہے اور جن کا مقصد انسانیت کی تعمیر اور معاشرہ کی تطہیر ہے - قرآن کے اس ادبی اسلوب اور صحت‌مند حقیقت نگاری کے سامنے وہ واضح اور متعین اخلاق قدریں ہیں جن کو ابھارنا اور پیدا کرنا ہی ہمارے ادب کا مقصد ہونا چاہئے -

ادب میں جنسی جذبہ کے اظہار کی اہمیت سے ہمیں انکار نہیں، لیکن جو چیز قابل اعتراض اور لائق توجہ ہے وہ ادیب کا طریقۂ اظہار ہے - جنس ہر دور اور ہر زمانہ میں ادب کا موضوع رہا ہے - جنس کا ذکر ادب میں آیا ہے اور آتا رہے گا - یہ ذکر کبھی کبھی تو اپنے عہد کے میلان، رجحان اور اخلاقی و سماجی نقطۂ نظر کا مظہر رہا ہے، لیکن زیادہ تر ہمارے ادبا و شعراء کی انفرادی جنسی گھٹن، ناآسودگی، کجروی اور ذہنی بیماری کا نتیجہ ہوتا ہے - ہر دور اور ہر عہد کی شاعری کے بڑے حصہ پر اس عہد کے سماجی حالات اور اخلاقی نقطۂ نظر کی چھاپ رہتی ہے - عربی شاعری کا ابتدائی دور جسے ہم جاہلی شاعری سے تعبیر کرتے ہیں، اس میں شجاعت، سخاوت، حسب و نسب کا غرور، فخر و مباہات کا بیجا اظہار زیادہ ملتا ہے - اس کے علاوہ یہ شاعری فطرت کی سادہ منظر کشی، ریت کے ٹیلوں، کھجوروں کے خوشنما جھنڈ اور اونچی نیچی پہاڑیوں کے بیان، اونٹوں اور گھوڑوں کے تذکرے سے بھری پڑی ہے، ساتھ ہی محبوب کا والہانہ اور دل آویز ذکر

بھی نظر آئے گا اور یہی دورِ جاہلیت میں عربوں کا مجموعی اخلاقی نقطۂ نظر اور سماجی رجحان تھا، جس کا عکس ہمیں عربی شاعری کے بڑے حصہ میں نظر آتا ہے۔ عربی شاعری میں اس عام روش سے ہٹ کر فحش نگاری کے بھی کچھ نمونے ملتے ہیں خصوصاً امراء القیس کی شاعری فنی بلندی کے ساتھ فحاشی اور جنسی تلذذ میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی وجہ امرء القیس کا انفرادی جنسی ذہن، نا آسودگی اور اس کی ذہنی کجروی ہے۔ اسلام کے بعد عربی شاعری میں جب اخلاقی اقدار کا اضافہ ہوا تو اس سے شاعری کا سانچا اور اس کا اسلوب یکسر بدل گیا۔ حضرت رسول کے اس فرمان نے کہ امرء القیس جہاں فن کا امام ہے وہاں جہنمیوں کا بھی سردار ہے، اس کی حیثیت اور شاعری کی وقعت دونوں ہی پر خاک ڈالدی۔ جاہلی شعراء میں بھی آپ نے اُنہیں شعراء کی تحسین و تعریف فرمائی جن کے یہاں عام انسانی اخلاقی قدریں، حکمت کی باتیں اور توحید کا تصور پایا جاتا تھا۔ اس طرح اسلام کی صبح سعادت کے بعد عربی شاعری، فکر کی روشنی، یقین کی گرمی اور زندگی و حرارت سے مالامال ہوگئی، جو اسلام کے اخلاقی اقدار و تصورات کی دین تھا۔ فارسی شاعری کا ابتدائی دور بھی وہاں کے مذہب و اخلاق اور تہذیبی و سماجی پس منظر کا آئینہ دار ہے۔ اسلام کے بعد تصوف و اخلاق کے اثر نے مجاز سے حقیقت کی طرف فارسی شاعری کے رخ کو موڑا، حافظ نے بادہ و ساغر کے پردہ میں مشاہدۂ حق کی بات کی اور سعدی نے تو محض اخلاقی اقدار کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

اس تجزیہ کا مقصود اس حقیقت کا اظہار کرنا ہے کہ جنس کا موضوع ہر عہد کی شاعری مین رہا ہے لیکن اس کے پیچھے حقیقتاً اس عہد کا اخلاقی اور سماجی فلسفہ کام کرتا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر عہد میں جنسی جذبہ کی تہذیب و ترتیب اور اخلاق سے اس کا ربط و تعلق پیدا کیا جائے اور سماج کو اخلاقی اقدار کے ماتحت متوازن بنایا جائے تاکہ ادب و شاعری میں اس کے اظہار کے ذرائع اور طریقے بھی متوازن ہوں۔ اس طرح بنظر عمیق اگر دیکھا جائے تو اخلاقی اقدار کا ہمارے سماج سے گہرا ربط اور تعلق ہے۔ ادب و شاعری کے معیار کا تمام تر انحصار سماج کے اخلاقی نقطۂ نظر اور اس کے اندر اخلاقی اقدار کے اثر و نفوذ پر ہے۔

اس طویل تجزیہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ادب میں اخلاقی

اقدار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جو فرد کی سیرت کی تشکیل اور بحیثیت مجموعی پورے سماج کی صحت‌مند تعمیر کے لیے ضروری ہے - سماج میں اخلاقی قدریں ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتی ہیں - ایک صالح اور صحت‌مند سماج کے لئے اخلاقی قدروں کی جو اہمیت ہے اس سے آج کے بےخدا اور بےاخلاق حکومت و سماج میں رہتے ہوئے ہم میں سے کون انکار کرسکتا ہے ؟ آج کا الحاد اور اخلاقی نراج موجودہ انسانی تاریخ میں ایک انتہائی ناپسندیدہ اور مضر حادثہ ہے جس کے ناخوشگوار اثرات سے نئی نسلوں کے ذہن زہر آلود ہورہے ہیں اور ان میں ذہنی و فکری اور اخلاقی نراج برپا ہے - اس لئے ادب میں بھی اخلاقی اقدار کا واضح طور پر یقین ہونا چاہئے -

ادب میں اخلاقی اقدار کا جب ذکر آتا ہے تو یہ مسئلہ ادبی سے زیادہ سماجی اور معاشرتی بن جاتا ہے اور پھر اس سلسلہ میں مختلف قسم کے سوالات سامنے آتے ہیں- اخلاق کیا ہے ؟ اس کا مقصود کیا ہونا چاہئے ؟ اس کا ماخذ اور منبع کیا ہے ؟ اس کے پیچھے کوئی قوت نافذہ ہے یا نہیں ؟ انسان کو اخلاقی عمل پر ابھارنے کے لئے کیا کوئی قوت محرکہ بھی ہے ؟ یہ تمام سوالات اخلاق کے سلسلہ میں بنیادی سوال ہیں - ان کی وضاحت ہی سے شعر و ادب کی دنیا میں بھی واضح طور پر اخلاقی اقدار کا تعین ہوسکتا ہے - اس سلسلہ میں طوالت کے خوف سے صرف چند اشاروں پر اکتفا کروں گا -

اخلاق حقیقتاً ہم انسانوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لئے لازمی اور ضروری ہے - کائنات کا ہر حسن انسان کے دل و نگاہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے - اس طرح ہمارا اس جہان رنگ و بو کی ہر شے سے کچھ نہ کچھ تعلق ہوجاتا ہے - اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے - انسان کے اندر اخلاقی حس ایک فطری حس ہے جسے ہم انسان کے اندر کی آواز کہہ سکتے ہیں ، اسی اندر کی آواز کو فطرت ، ضمیر ، وجدان ، حاسہ ، اخلاق مختلف ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے - ان فلسفیانہ تعبیرات سے ہٹ کر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر حقیقت ہیں جو ہمیشہ سے جانی اور پہچانی ہیں- نیکی اور بدی کا شعور انسان کی فطرت میں ودیعت ہے - یہ ایک قسم کا اخلاقی وجدان ہے جو ہر انسان کے اندر فطرتاً موجود ہے ، جس کے ذریعہ ہم اخلاقی اقدار کا احساس کرتے ہیں - جس طرح انسان کی فطرت میں دوسرے وجدانیات ہیں ، جن سے ہم حسن و

قبح اور خوبصورتی و بدصورتی کا احساس کرتے ہیں، اسی طرح ہمارے اندر اخلاقی حاسہ بھی ہے جس کے ذریعہ ہم اخلاق کی اچھائی اور برائی کا ادراک کرتے ہیں - یہ حس انفرادی طور پر اشخاص میں کم و بیش ہوسکتا ہے، لیکن مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے انسانی اخلاق کے بعض اوصاف پر فضائل اور خوبی کا اور بعض اوصاف پر رذائل اور برائی کا یکساں حکم لگایا ہے - صدق، زبان کی سچائی، دل کی سچائی، عمل کی سچائی، سخاوت، عفت و پاکبازی، دیانت و امانت، شرم و حیا، رحم، عدل و انصاف، احسان، عفو و درگذر، حلم و بردباری، لطف و مہربانی، تواضع و خاکساری، خوش کلامی، ایثار، اعتدال، خودداری، عزت نفس، شجاعت، استقامت، حق گوئی، استغنا وغیرہ یہ ایسے فضائل انسانی ہیں، جن کو ہر دور اور ہر زمانے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور ان کے برخلاف کذب، وعدہ خلافی، خیانت، بددیانتی، غداری اور دغابازی، بہتان، چغل خوری، غیبت، بدگوئی، دو رخاپن، بدگمانی، مداحی، خوشامد، بخل، حرص و طمع، بےایمانی، چوری، ناپ تول میں کمی و بیشی، رشوت، شراب نوشی، غیض و غضب، بغض و کینہ، ظلم، فخر و غرور، ریا، خودبینی، حسد، فحش گوئی، وغیرہ یہ ایسے رذایل اخلاق ہیں، جن کو سماج میں کبھی اچھا نہیں سمجھا گیا، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے، جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعت دونوں ہی کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں - یہی وہ مستقل اخلاقی قدریں (Values) ہیں، جو تمام بدلے ہوئے حالات اور ہر دور اور ہر زمانے میں یکساں اپنی جگہ ثابت و قائم رہ سکتی ہیں، جن میں کوئی تبدل و تغیر ممکن نہیں - ان اخلاقی اقدار کو عمل کی دنیا میں بروےکار لانے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ حیات و کائنات کو باخدا تصور کیا جائے اور اس کا مقصود رضاے الٰہی قرار دیا جائے اس لئے کہ خدا کی رضا ہی انسان کو ان اخلاقی اعمال پر اُبھار سکتا ہے اور اس سے اخلاق کو ایک ایسا بلند ترین معیار مل جاتا ہے، جس کی بدولت اخلاقی ارتقا کے امکانات کی کوئی حد نہیں رہتی -

زندگی میں ان اخلاقی اقدار کی اتنی اہمیت ہے کہ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ بھی اِس کے ہمہ گیر اثر سے بچ نہیں سکتا - ضرورت ہے کہ ہر جگہ اور ہر شعبۂ زندگی میں، خواہ انفرادی کردار، گھریلو معاشرت، شہری زندگی، ملکی سیاست ہو یا معاشی کاروبار، منڈی، بازار اور بین الاقوامی ادارہ ہو، اخلاق کو حکمراں بنایا جائے اور اس کی

کوشش ہونی چاہئے کہ معاملات زندگی کی باگیں، خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کے بجائے اخلاق کے ہاتھوں میں ہوں ۔ زندگی میں اخلاق کی اس اہمیت کے بعد ہی ایک صالح صحت مند سماج کی تعمیر ممکن ہے ۔ ان اخلاقی اقدار کو سماجی زندگی کے رگ و ریشے میں اسی طرح رچ بس جانا چاہئے ۔

شاخ گل میں جس طرح باد سحرگاہی کا نم

اخلاق کے ان بنیادی اقدار کو ہمارے ادبی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہئے ۔ ادب اور اخلاق دونوں ہی کا مقصود یہ ہے کہ ہماری زندگی میں پاکیزگی اور شادابی آئے اور ایک ایسے نظام زندگی کو پروان چڑھایا جائے جس میں اخلاق کو بنیادی اہمیت حاصل ہو، مادیت کا تصور کم اور روحانیت کا تصور زیادہ ہو، جس میں گندگی اور فحاشی نہ ہو، نفرت، عداوت اور حسد و خودغرضی کے ذلیل جذبات دبیں اور ختم ہوں، نیکی، شرافت، صداقت، اور عدالت کے پاک جذبات اُبھریں اور پروان چڑھیں ۔ آج کی دنیا ایسے ہی نظام حیات کی متمنی ہے ۔ اب یہ ہمارے ادباء و شعراء کا فرض ہے کہ اپنی تخلیقات سے ایسا ذہن اور مزاج پیدا کریں جو ایک صالح نظام زندگی کی بنیاد بن سکے ۔ اس طرح اگر ادب اور آرٹ میں اخلاقی اقدار پیش کی جائیں گی تو اس سے آرٹ کی حیثیت مجروح نہ ہوگی بلکہ تجربہ کا اخلاص، فن کی صداقت اور روح کا جذبہ ایسے فن کار کے فنی کارناموں کو تابش دوام بخشے گا ۔ ایسا شعر و ادب جس میں اخلاق کا کوئی تصور نہ ہو وہ بجائے خود کوئی اعلیٰ تخلیق نہیں ہوسکتا اور اس کے پڑھنے سے ہمارے سرمایۂ مسرت و بصیرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا ۔ میتھیو آرنلڈ کا یہ قول مبنی برصداقت ہے کہ جو شاعری اخلاقیات سے بغاوت کرتی ہے اور جو اخلاقیات کو پس پشت ڈال دیتی ہے، وہ زندگی کو بھی پس پشت ڈال دیتی ہے ۔

ادب اور اخلاق کا یہ باہمی تعلق ایک بڑا ہی اہم اور نازک مسئلہ ہے، اس کے لئے فن کار میں کمال فن اور کمال اخلاق کی ضرورت ہے اور اسکے لئے ایسا ذہنی توازن، عملی توافق درکار ہے جو دونوں کو کمال فن کے ساتھ ہم آہنگ بنا سکے ۔ اب سوال یہ ہے کہ اخلاقی قدروں کے ادب میں انعکاس کا طریقہ کیا ہو ؟ اس پر ابھی مزید غور و فکر کی ضرورت ہے ۔ میرے خیال میں ادیب و شاعر کے اخلاقی احساسات جتنے عمیق اور ان میں اس کا شعور جتنا واضح ہوگا ان کے تخلیقات میں اس کے اثرات اتنے ہی گہرے اور

نمایاں ہوں گے - نیکی اور خیر کے اخلاقی اقدار انسان سے باہر اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے بلکہ خود اس کے عمل میں مضمر ہوتے ہیں، اور عمل پر وہی مجبور ہوتا ہے جس کے دل میں آرزو کی خلش ہو - یہ خلش آرزو ہی ایک اچھے ادیب کو حیات بخش تخلیق پر آمادہ کرتی ہے - وہ ادیب و شاعر جو اپنی اخلاقی تکمیل کی کوشش کرتا ہے، اس سے صرف اس کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہوتی بلکہ حقیقتاً وہ زندگی کی اقدار اور ادب کے معیار میں اضافہ کرتا ہے، اس طرح اس کا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اخلاقی اقدار اور ادبی اقدار میں اپنی تخلیقات کے ذریعہ کامل ہم آہنگی اور ربط و تعلق پیدا کرے تاکہ اس کی تخلیقات ادبی دنیا میں صالح، صحت‌مند اور اعلیٰ ادب کا نمونہ بن سکیں - اسکے لئے گہرے ادبی شعور کے ساتھ دائمی اخلاقی قدروں پر گہری نظر اور اس پر اذغان و یقین کی ضرورت ہے - تاکہ وہ اخلاقی قدریں ادیب و شاعر کے لئے جذبہ بن جائیں - ادب میں فطری طریقہ پر اخلاقی قدروں کے انعکاس کے لئے ادیب و شاعر کی عملی زندگی میں اس کا اظہار ضروری ہے، اچھے فن‌کار کے لئے کردار کا ہونا لازمی ہے - اچھا ادب ہی اچھا انسان پیدا کرسکتا ہے - قرآن نے ان شعراء کی مذمت کی ہے جن کے قول و عمل میں تضاد ہو لیکن وہ ادیب و شاعر جو خدا پرست، عمل صالح رکھنے والے اور بلند کردار ہیں، وہ سماج، انسانیت اور خود شعر و ادب کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہیں -

---

ماضئ تمام کے تین صیغے

از

سونیا چیر نی کووا

[سونیا چیرنی کووا صاحبہ ماسکو کے انسٹی ٹیوٹ آف انٹر نیشنل ریلیشن کے شعبۂ اردو میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کررھی ھیں۔ ان کی تحقیق کا خاص میدان اردو زبان کے « افعال » کی پیچیدہ شکلیں ھیں۔ اس زبان کے « افعال » پر اب تک اردو یا انگریزی میں جو کچھ لکھا گیا ھے وہ ناکافی اور تشنہ ھے۔ غیر زبان بولنے والے کو اچھی اردو سیکھنے میں سب سے زیادہ دقت انھیں افعال کی مختلف شکلیں سیکھنے میں پیش آتی ھے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس کی جارھی تھی کہ اردو افعال پر ایک مفصل تحقیقی مقالہ تصنیف کیا جائے۔ میرا خیال ھے کہ سونیا صاحبہ نے ایک بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ھے جو مکمل ھوجانے کے بعد اھل زبان کے لئے نہ صرف حیرت بلکہ عبرت کا بھی باعث ھوگا۔ یہ مضمون ترجمہ نہیں بلکہ مصنفہ کی اصل تحریر ھے۔

[ایڈیٹر]

زمانہ فعل کے ان صیغوں کا نام ھے جو یہ دکھاتا ھے کہ کام بولنے کے وقت سے کیا تعلق رکھتا ھے۔ مثال کے طور پر، ماضی یہ ظاھر کرتا ھے کہ کام بولنے کے وقت سے پہلے ھوا ھے۔

ماضی کی تقسیم دو حصوں میں کی جاسکتی ھے۔ ماضی ناتمام اور ماضی تمام۔ اردو اور ھندی میں ماضئ تمام کے تین صیغے ھیں۔ ماضی تمام، ماضی قبل ماضی اور حال تمام۔ یہ فعلوں کا وہ گروہ ھے جو یہ ظاھر کرتا ھے کہ کام گزر چکا ھے۔ لسانیات میں کام کا گزر چکا ھونا صورت کہلاتا ھے۔ اس لحاظ سے ماضی تمام کے ٹین صیغوں میں کوئی فرق نہیں ھے۔ ان میں جو فرق پایا جاتا ھے وہ یہ کہ ھر صیغے کے ذریعہ ظاھر کئے ھوئے کام کا اپنا زمانی تعین ھوتا ھے۔ ماضی تمام کا صیغہ یہ دکھاتا ھے کہ اس سے ظاھر کیا ھوا کام اس وقت میں گزرا ھوتا ھے جس کا حال یا ماضی میں کسی مقرر لمحے سے تعلق کا تعین نہ کیا جائے۔ حال تمام کے صیغے کے ذریعہ گزرا

ہوا کام بولنے کے وقت سے ملایا جاتا ہے۔ ماضی قبل ماضی یہ ظاہر کرتا ہے کہ گزرا ہوا کام ماضی میں کسی مقرر لمحے سے پہلے ہو چکا تھا۔

مگر ماضی تمام کے ان تین صیغوں کا یہ فرق ان تینوں کی سب خصوصیات نہیں بتاتا۔ ماضی تمام اور ماضی قبل ماضی کے ذریعہ ظاہر کئے ہوئے کام بھی بولنے کے وقت سے ملائے جاسکتے ہیں۔ کسی دو صیغوں کے ایک جیسی صورتوں میں استعمال کا فرق آسانی سے محسوس نہیں ہوتا۔ عبارت میں ماضی تمام کے تین صیغوں میں ہر ایک کے مختلف استعمال ہیں اور استعمال کے لحاظ سے ان میں بعض باریک فرق موجود ہوتے ہیں۔ ہر صیغے کے مختلف استعمال مختلف حالتوں اور کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

اب تک قواعد اردو اور ہندی کی کتابوں میں ماضی تمام کے تین صیغوں کے نحوی استعمال پر کم توجہ دی گئی ہے۔ اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ ماضی تمام کے تین صیغوں کے نحوی استعمال کی خصوصیات کا تعین کیا جائے۔ ماضی تمام کے تین صیغوں کا استعمال اردو اور ہندی گرامر کا ایک اہم مگر پیچیدہ اور غیر متعین مسئلہ ہے۔ ماضی تمام کہ ان تین صیغوں کو سمجھ لینے کے بعد اردو اور ہندی کے کچھ دوسرے فعلوں کی خصوصیت سمجھنا آسان ہوجائے گا۔ مثلاً کرتا رہا، کرتا رہا ہے، کرتا رہا تھا، کرتا گیا۔

ماضی تمام کی تین شکلوں کے بارے میں بحث کرتے وقت فعل مرکب اور مفرد کا بھی سوال آتا ہے جس سے یہ مسئلہ اور مشکل ہوجاتا ہے۔ یہاں ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ اصل فعل کے ساتھ «لینا» «دینا» «جانا» وغیرہ جوڑنے سے اسکے معنی میں کیا تھوڑا بہت تغیر ہوجاتا ہے۔ یہ مرکب افعال کا موضوع ہے جو ہمارے اس مقالے سے تعلق نہیں رکھتا۔

جب ہم ماضی قبل ماضی اور حال تمام کی بحث میں مفرد اور مرکب فعل کا نام لیتے ہیں تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ اصل فعل کے ساتھ (چاہے وہ خود مرکب ہو مثلاً، شامل ہونا، حاصل کرنا) کوئی اور فعل معنی میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے جوڑا جائے۔

ماضی تمام کے تین صیغوں کے استعمال بتاتے وقت جملۂ تمیزی کے لئے الگ جگہ رکھنا ٹھیک معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس قسم کے جملوں میں ماضی قبل ماضی کا فرق اپنی الگ خصوصیت رکھتا ہے۔

۱ــ جب ماضی میں گزرے ہوئے کام کا تعین حال یا ماضی مین کسی مقرر لمحے سے نہ کیا جائے تو ماضی تمام کا استعمال ہوتا ہے ۔ اس سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ کام گذشتہ زمانے میں ہوا ہے جبکہ باقی دو (حال تمام اور ماضی قبل ماضی) یہ دکھاتے ہیں کہ گزرے ہوئے کام کا بولنے کے وقت سے کیا تعلق ہے ۔ مثلاً ــ

« انیل ! » اس کے دماغ میں یہ انجانا نام بم کے گولے کی طرح پھٹا (عباس ڈیڈ لیٹر ۔ ۱۰۶)

.... ایک مرتبہ جہاز پر سے کود کر ڈوبتے کو نکالا ، یوں انعام پائے اور فلاں فلاں اخبار میں میری تعریف چھپی ..... (سرشار ۔ فسانہ آزاد ، جلد دوم ۔ ٦٧)

کپتان اس مقام پر بیٹھ گیا ۔ ایک شخص نے کہا .... (سرشار ۔ فسانۂ آزاد ۔ جلد دوم ۔ ٦٥)

دوسرے دن سے گوبر نے مالتی کے یہاں کام کرنا شروع کردیا ۔ اسے اچھے رہنے کو ایک کوٹھی بھی مل گئی ۔ جھنیا بھی آگئی (پریم چند گودان ۔ ٥٤٩)

مسکرا کر مصافحہ کیا مگر آزاد کی سرد مہری پر کمال رنج ہوا قریب کی ایک کرسی پر بیٹھیں (سرشار ۔ فسانۂ آزاد ۔ جلد دوم ۔ ۲۹٤)

زمانۂ ماضی میں اگر کئی کام ایک دوسرے کے بعد ہوئے ہوں اور ان کو بیان کیا جارہا ہو تو ایسے جملوں میں ماضی تمام کا فعل آتا ہے ۔ یہ صورت عام طور پر بیانیہ قصوں میں پیدا ہوتی ہے جیسے ایک دن حسب معمول احباب کا جلسہ تھا ۔ کوئی غزل پڑھ رہا تھا ۔ احباب داد دے رہے تھے اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا ۔ اس کھڑکی کی طرف سے واہ واہ کی آواز آئی ۔ میں چپ ہوگیا اور احباب بھی اس طرف متوجہ ہوگئے ۔ منشی احمد حسین نے پکار کے کہا غائبانہ تعریف ٹھیک نہیں ۔ اگر شوق شعر و سخن ہے جلسہ میں تشریف لائیے ۔ اس کا کوئی جواب نہ ملا ۔ میں غزل پڑھنے لگا ۔ بات رفت گزشت ہوئی تھوڑی دیر کے بعد ایک « مہری » آئی اور اس نے پہلے سب کو سلام کیا پھر یہہ کہا ۔

« مرزا رسوا کون صاحب ہیں؟ » احباب نے مجھے بتادیا ۔ مہری نے کہا « بیوی نے ذرا آپ کو بلایا ہے » (مرزا رسوا ۔ امراؤ جان ادا ۔ ۳) ۔

اگر جملے میں مناسب الفاظ موجود ہوں تو ماضی تمام کا صیغہ کچھ عرصے تک کئی بار ہونے والے کاموں کو ظاہر کرنے کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے مثلاً -

رات کو کراہ کراہ کر کئی بار جاگے (عصمت چغتائی) - (تین اناڑی - ٦٤)

. . . . ہم نے تو برسوں اندھے فقیر کی غلامی کی . . . . . (پریم چند - پردۂ مجاز - ۲۰)

لیکن اگر ان مخصوص الفاظ کو جملے میں سے نکال دیا جائے تو کام کی تکرار یا تسلسل کا احساس باقی نہیں رہتا -

۲ــــماضی تمام کے صیغے سے ظاہر کیا ہوا کام حال تمام کے صیغے سے ظاہر کئے ہوئے کام کی طرح بولنے کے وقت سے ملادیا جاسکتا ہے - اگرچہ گذرے ہوئے کام کے نتیجہ کا بولتے وقت موجود ہونا موجودہ حالت سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے تاہم کہنے والے کا مطلب کام کے گذر چکے ہونے سے ہے - جیسے -

مہتا کو ایسا معلوم ہوا گویا ان نرم و نازک ہاتھوں نے سارا درد کھینچ لیا (پریم چند - گؤدان - ٥٥٧) -

اسے تو میں نہ لےجاؤں گا سرکار! آپ اتنی دور سے آئے، اس کڑی دھوپ میں شکار کیا، میں کیسے اٹھالے جاؤں؟ (پریم چند - گؤدان - ١٥٦) -

آج تیس سال زندگی سے لڑتے رہنے کے بعد وہ ہار گیا - (پریم چند - گؤدان - ٥٨٥) -

میں سمجھا تھا کہ بس اب وارنٹ آیا اور پولیس والوں نے گرفتار کیا اور قمرن عمر بھر کے لئے چھٹیں اور ہم قید ہوئے (سرشار - سیر کہسار، جلد دوم ــــ ٣٦٥) -

جب کام کو بولنے کے وقت سے ملا دیا جاتا ہے اور حال تمام استعمال کیا جاتا ہے تو توجہ کا مرکز گذرے ہوئے کام کا نتیجہ ہوتا ہے - اس نتیجہ کی طرف سننے والے کی توجہ دلائی جاتی ہے جیسے -

ڈاکٹر صاحب نے کہا - ردی حالت ہے - بڑا صدمہ پہونچا ہے - علاج مشکل ہے - (سرشار - فسانۂ آزاد جلد دوم ــــ ٢٦١) -

کانوں پر یقین نہ آیا بولا: «ارے نہیں مالک» ھجور نے شکار کیا ھے، سو ھم کیسے کھالیں» (پریم چند، گؤدان ــ ۱۵٦) -

کچھ، اور کہنے والے تھے کہ ایک چپراسی نے آکر کہا: سرکار، بیگاروں نے کام کرنے سے انکار کردیا ھے . . . (پریم چند، گؤدان - ۲۲)-

۳ــ ماضی تمام کا صیغہ مستقبل کے معنی میں استعمال ھوتا ھے:

۱ــ قریب ترین مستقبل کے معنی میں یہ مفہوم مفرد فعل کے ذریعہ ظاھر کیا جاتا ھے - جیسے:

آخر طاقت نہ رھی اور پیٹ میں آگ لگی، نزدیک تھا کہ روح بدن سے نکلے (میر امن - باغ و بہار - ۱۳۰) -

دل ھی دل میں سوچنے لگے کہ آج ھڈی پسلی ٹوٹی - یہ تو کچا ھی کھاجائے گا- (سرشار - فسانۂ آزاد، جلد دوم - ۲۸۳) -

کہنے اور کام کرنے کے درمیان کم وقفہ دکھانا مقصود ھوتا ھے جیسے -

میں ابھی آئی، ذرا لکشمی بائی سے تھوڑے سے پاپڑ لے آؤں - (عصمت چغتائی معصومہ ۲۸) -

« . . . اچھا میں چلی» خالدہ نے چادر اوڑھتے ھوئے کہا- (صالحہ عابد حسین راہ عمل - ٤٦٦) -

«میں تو یہ کہہ رھا ھوں ساجورانی کہ آج ذرا سی چائے تو پلادو» -

«اچھا اچھا - ابھی لائی» - (صالحہ عابد حسین راہ عمل - ۲۷۱ - ۲۷۰)

اگر اپنے باپ کا ھے تو ٹھہر جا، میں آیا - (سرشار کامنی - ۳۹٤)

۲ــ ماضی تمام کے صیغے سے ظاھر کیا ھوا کام کسی تصور کی نفی کرتا ھے- کہنے والے کو کام کے کبھی عمل میں نہ آنے کا پورا یقین ھوتا ھے - جیسے:

«ھم اسے اپنے گھر میں رکھ لیں گے»

«جی ھاں بہت رکھا اپنے گھر میں، خالہ اماں گولی مار دیں گی (عصمت چغتائی تین اناڑی - ٤۹) -

بھلا مہاجن، ھوں، کیوں دینے لگا - (مرزا رسوا ـ امراو جان ادا - ۷۷)

واہ میں اس نیک کام میں کیوں خلل ڈالنے لگی، میں اسی ہفتہ میں آپ کے کپڑے دے دوں گی . . . (پریم چند — سہاگ کا جنازہ ۔ ۲۲۹) ۔

۳—مفرد اور مرکب جملوں میں جہاں ایسے دو فعل دئے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے لازمی تعلق رکھتے ہیں ۔ ایک کام کا عمل میں آنا دوسرے کام کے عمل میں آنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے ۔ جیسے

اب تو ان کی لاج اس طرح بچ گئی کہ اس لونڈے کی خوشامد کرتے ہیں ۔ وہ ذرا بھی خلل انداز ہوئے اور عزت خاک میں مل گئی ۔ (پریم چند ۔ گئودان ۔ ۵۲٤)

اوہ تو ابھی عرصہ ہے ۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا اور چلا ۔ (سرشار ۔ فسانۂ آزاد، جلد دوم ۔ ۱۲)

. . . اور یہ تو مجھکو پورا پورا یقین ہے کہ ادھر مجھے دیکھا اور ادھر یہ گئیں (سرشار - کامنی ۔ ۳۲۹)

. . . جس دن یہ کنجی ہاتھ آگئی بس فتح ہے ۔ (پریم چند ۔ گئودان ۔ ۱٤۵)

ایسے جملوں میں "جیسے ہی" "جس وقت" کی قسم کے لفظ محذوف ہوتے ہیں

٤—زیادہ تر شرطیہ جملوں میں ماضی تمام مستقبل کے معنی دیتا ہے جیسے

. . . . بھگوان نے چاہا تو سو روپیے اس بیانے (جننے) میں پیٹ لوں گا (پریم چند - گئودان ۔ ۱۰)

اگر کوٹھی بک گئی تو برا ہوگا ۔ (عصمت چغتائی ۔ تین اناڑی ۔ ٤۷)

. . . یہ آشا ٹوٹی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی . . .

(شورش - پتھروں کا سوداگر—۱۰۱)

ایسے شرطیہ جملوں میں پہلے فقرے میں ماضی تمام کا فعل اور دوسرے فقرے میں مستقبل کا فعل ہوتا ہے ۔

آیا جی - خدا گواہ ہے میری جان سن سے نکل جائے گی جو آپ پہلو سے چلی گئیں (سرشار - سیر کہسار - جلد دوم—۵۰۳)

اس قسم کے بہت سے جملوں میں دھمکی آمیز احساس شامل ہوتا ہے ۔ جیسے

رائے صاحب نے گرم ہو کر کہا: اگر اس نے دیوی جی کو ہاتھ لگایا تو چاہے میری لاش یہیں تڑپنے لگے، میں اس سے بھڑ جاؤں گا۔ . . (پریم چند ۔ گئودان ـــ ۱۱۷)

دھنیا نے سب کو سنا سنا کر کہدیا کہ کسی نے اسے پانی بھرنے سے روکا تو اس کا اور اپنا خون ایک کردوں گی ۔ (گئودان ۲۰۲) ۔

اب جب سے میرے دیور نے للکارا کہ خبردار یہاں آئی، دھلیز کے اندر قدم رکھا تو ٹانگیں کاٹ ڈالوں گا، تب سے نہیں آئی - (سرشار - کامنی ۲۸۲) ۔

٤ـــ ماضی تمام کا صیغۂ زمانہ حال یا ماضی ناتمام کے معنی دیتا ہے ۔ لیکن ضروری ہے کہ عبارت کے سیاق و سباق سے حال یا ماضی ناتمام کا مفہوم واضح طور پر ظاہر ہوتا ہو ۔

اس صورت میں بار بار کے یا روزمرہ کے ہونے والے واقعہ کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے گویا یہ محض ایک بار یا ایک دن ہوا ہے - اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سننے والے کی توجہ اس واقعہ پر مرکوز ہوجاتی ہے اور واقعہ زیادہ واضح طور پر اسکے ذہن نشین ہوجاتا ہے ۔

بھئی ان ماسٹروں کے خوب ٹھاٹ ہیں ۔ مزے سے سائکلوں پر دندناتے پھر رہے ہیں ۔ جسے جب جی چاہا ٹھوک دیا - مرغا بنا کر کرسی رکھدی اور غصہ آیا تو کونے میں منھ دے کر چھٹی کے گھنٹے میں کھڑا کردیا ۔ کوئی جملہ پانچ سو دفعہ لکھنے کو دے دیا، نظمیں رٹوالیں - (عصمت چغتائی - تین اناڑی ـــ ۷۷) ۔

اسکی یہ کیفیت کہ ادھر محمد عسکری دروازے پر آئے اور وہ کودتی ہوئی دوڑی کہ « عسکری میاں آئے » ۔ (سرشار ۔ فسانۂ آزاد، جلد دوم ـــ ۲۵۳) ۔

محفل بھر میں سب کی نگاہ ان کی طرف ہے ۔ یہ آنکھ اٹھاکے بھی نہیں دیکھتیں، پھر جدھر دیکھ لیا ادھر سب دیکھنے لگے ۔ جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے اس پر ہزاروں کی نگاہیں پڑتی ہیں (مرزا رسوا ۔ امراو جان ادا ۔ ۵۰) ۔

کسی مقام پر کامنی کو چین نہیں آتا تھا ۔ کسی سے بولتی تھی نہ چالتی تھی ۔ کبھی اس کمرے میں گئی اور کھڑی ہوکے واپس آئی، کبھی اس کمرے میں جاکے مونڈھے پر بیٹھی کچھ سوچنے لگی، کبھی باہر آئی کبھ پھر تلاا اور زینب کی ماں کے پاس ذرا بیٹھی ۔ (سرشار ۔ کامنی ۴۱۶ ۔ ۴۱۷) ۔

ماضی تمام

۱	۲	۳	٤
زمانہ حال اور ماضی ناتمام کے معنی میں جیسے : تمہیں کیا ؟ گھر سے تمہیں کوئی دلچسپی ہو تو معلوم ہو - بس سویرے اٹھے اور دفتر چلے گئے — شام ہوئی آ گئے —	مستقبل کے معنی میں : میں ابھی آئی	کام بولنے کے وقت سے ملایا جاتا ہے : اس نے یہ کیوں کیا ؟	کام گذشتہ زمانے میں ہوا ہے : اور باتوں ہی باتوں میں میں نے اُس فقیر کا ذکر چھیڑا نام سنتے ہی کھل گئی

حال تمام

اردو قواعد کی کچھہ کتابوں میں یہ صیغہ حال کے صیغوں میں شامل کیا جاتا ہے* مگر ہمارے خیال میں یہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس سے جو کام ظاہر ہوتا ہے وہ گزر چکا ہوتا ہے - ماضی تمام کے اس صیغے کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ گزرے ہوے کام کو بولنے کے وقت سے ملادیتا ہے -

میں نے حال تمام کے تین الگ الگ استعمال دیکھے ہیں جن کا بیان اس مقالے میں کیا جاتا ہے —

* ڈاکٹر مولوی عبد الحق - اردو قواعد تاج پبلشرز - دھلی

کام بولنے کے وقت سے پہلے یا ذرا پہلے یا بہت پہلے ہوا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ بولنے کے وقت ظاہر ہونا ضروری ہے جیسے:

انھوں نے پوچھا «آپ کو اس کی خبر کیوں کر ہوئی؟»

«ابھی ابھی رور پال نے لڑکی کے نام ایک خط بھیجا ہے جو اس نے مجھے دے دیا» (پریم چند: گؤدان، ۵۳۰)

«. . . میں نے بہت دن ہوئے کہ خود کو تمھارے چرنوں کی بھینٹ کردیا ہے تم میرے رہنما ہو. . . .» (پریم چند: گؤدان، ۵۵ء)

«. . . . جب سے آپ کو ہوم ممبری ملی ہے، آپ کے بارے میں اس کی رائے ضرور بدل گئی ہوگی» (پریم چند: گؤدان، ۵۲۵)

گزرے ہوئے کام کا نتیجہ مادی اور غیر مادی دو صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

۱— نتیجے کا مادی شکل میں ظاہر ہونا۔ جو کام ہوچکا ہے وہ اب اپنی خاص ظاہری صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، جیسے:

مرکب فعل متعدی

«. . . . ثبوت کیا ہے کہ ابھی لگان ادا کردیا ہے؟ (پریم چند: گؤدان، ۲۰۹)

«رانی منورما اب نئے محل میں رہتی ہیں۔ انھوں نے کتنی ہی چڑیاں پال رکھی ہیں» (پردۂ مجاز، ۴۰۰)

«کندن - ہمارے میاں نے ہم کو چھوڑ دیا ہے - کچھ ہم نے نہیں چھوڑ دیا. . . . (سرشار: سیر کہسار، جلد دوم، ۴۹۹۔)

مفرد فعل متعدی ☆

«. . . . ہے تو میری پوتی مگر میں نے اپنی لڑکی کی طرح سے پالا ہے» (سرشار: سیر کہسار، جلد دوم، ۴۹۸)

«. . . . اپنی ہی برادری کے ہیں۔ تمھارے بابو جی انہیں کاشی سے اپنے ساتھ لائے ہیں. . . .» (پریم چند: پردۂ مجاز، ۳۵)

«ہنسیا۔ تمھارے لئے میں نے گھر چھوڑا ہے. . . .» (سرشار: کامنی، ۳۰۹ء)

فعل متعدی کی مفرد اور مرکب شکلوں کا فرق ہمارے اس مقالے سے تعلق نہیں

رکھتا - دو فعلوں کی باہم ترکیب سے اصل فعل کے معنوں میں تھوڑا بہت تغیر ہوجاتا ہے. جیسے اصل فعل کے ساتھ «لینا» جوڑنے سے فاعل کا فائدہ ظاہر ہوتا ہے -

مرکب فعل لازم ✡

«چھٹن - میں اتنی دیر سے اپنے دل میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ وہی قمرن ہیں یا پرستان سے کوئی پری سچ مچ اُتر آئی ہے» (سرشار : سیر کہسار، جلد دوم، ۳۳۱)

«. . . . اب اس وقت سے تہذیب بہت آگے بڑھ گئی ہے» (پریم چند : گؤدان، ۱۵۲)

«. . . . اس گپ کے قربان، کہنے لگے پانچ ہزار برس کا پیڑ ہے اور آسمان تک اس کی شاخیں پہونچ گئی ہین» . . . . (سرشار : فسانہ آزاد جلد دوم، ۸)

«. . . . اس نے ہم سے کہا کہ نواب کے گھر پڑگئی ہوں . . . .»
(سرشار : سیر کہسار، جلد دوم، صفحہ ۴۹۵)

مفرد فعل لازم ✡

«. . . بہت سے ثبوت بہم پہنچے ہیں» (سر شار، سیر کہسار، جلد دوم، ۲۱۸)

«میاں آزاد نے جگایا کہ خواجہ صاحب اٹھیے طوفان آیا ہے» (سرشار : فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۵۵)

«اس طرف سے دھوان اٹھا ہے» (سرشار : فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۱۵۷)

تاہم اس صورت میں فعل لازم مفرد بھی ہوسکتا ہے لیکن کچھہ جملوں میں یہ کام کے بجاے حالت دکھاتا ہے -

«سونا نے دیکھا کہ روپا باپ کی گود میں چڑھی ہے تو حسد ہوا» (پریم چند: گؤدان، ۲۵)

«وہاں جاکر سوچنے لگے کہ یہ عورت بیطور ہم پر ریجھی ہے» (سرشار : فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۲۲۵)

«. . . . اب آپ وہیں جائیے جہاں آپ ٹکے ہیں» (سرشار : فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۲۲۸)

بعض اوقات جملے میں استعمال شدہ فعل میں یہ امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ حالت کا اظہار کرتا ہے یا کام دکھاتا ہے - اوپر کے دوسرے اور تیسرے جملے میں «ریجھی ہے» اور «ٹکے ہیں» کی یہی کیفیت ہے -

فعل ناقص کا استعمال مرکب شکل میں ہوتا ہے جیسے ۔ « دیکھتا ہوں کہ اس کی ساڑی پھٹ گئی ہے » (پریم چند : گؤدان ، صفحہ ۱۹٤)

« آرائشوں سے بے نیاز ہوکر اس کا حسن چاند کے سادہ حسن کی طرح چمک اٹھا ہے » (پریم چند : پردۂ مجاز ، ۳۹۰)

کرپی نے کہا ۔ تیرا نوکر بچ گیا ہے ، مگر تیری گاڑی ٹوٹ گئی ہے ۔ اس کا برا حال ہے ۔ (سدرشن : پتھروں کا سوداگر ، ۵۸)*

« نظر آنا » « دیکھائی دینا (پڑنا) » « اچھا (برا) لگنا » « (ایسا . اچھا) معلوم ہونا » جیسے افعال ناقص مرکب ہونے کی وجہ سے عام طور پر اپنی شکل نہیں بدلتے ۔

فعل « ملنا » اور « ہونا » مفرد اور مرکب دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے

« اور ادھر مہراج بلی بھی ہزار غنیمت سمجھتے تھے کہ ایسی جوان حسینہ نازک بدن خوش قسمتی سے ملی ہے » (سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ٤٤۹)

« . . . . آج صبح صبح پندرہ سو کا سودا ہوا ہے . . . . » (پریم چند : گؤدان ، ۲۸۷)

« کچھ پاگل ہوا ہے کیا » (سرشار . سیر کہسار . جلد دوم ۳٤۳)

« . . . . ان کا امتحان تو ہوگیا ہے . . . . » (پریم چند : پردۂ مجاز ، ۳٦)

صیغہ حال تمام میں فعل کسی شخص یا چیز کے کردار کو ظاہر کرتا ہے یعنی یہ دکھاتا ہے کہ فلاں شخص یا چیز کیا سے کیا بن گئی ہے جیسے:

« دیکھا تو بادشاہ کی عجب صورت بن رہی ہے کہ زار بزار رونے اور دبلاپے سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں اور چہرہ زرد ہوگیا ہے » (میر امن : باغ و بہار ، صفحہ ۱۰)

---

* محض حالت ظاہر کرنے کے لیے حال تمام کے بجائے حالیہ معطوفہ کا استعمال ہوگا ۔ اس قسم کے جملوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی شخص یا چیز کو کس حالت میں پایا گیا ہے . اس صورت میں کبھی کبھی حالیہ معطوفہ کی علامت « ہوا » محذوف ہوتی ہے . جیسے « ہجور شہر میں دھوم مچی ہے کہ » (سرشار : سیر کہسار جلد دوم ، ۴۷۵)

« وہاں تو آج کل جنگ چھڑی ہے » (سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد دوم ، ۲۰) « جہاز پر ایک عجب طرح کی کھلبلی مچی ہوتی ہے کہ اتنے میں ہوا کا زور ذرا کم ہوگیا » (سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد دوم ، ۴۹)

« فرمانے لگی میں بہت تھک گئی ہوں اور بھوکی پیاسی ہو رہی ہوں » (میر امن: باغ و بہار ، ۵۹)

« مہراج - لڑکی کا چہرہ کیوں اتر گیاہے » (سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ۴۳۹)

«ذرا اپنا منہ تو شیشے میں دیکھو - ھڈیاں نکل آئی ہیں» (سدرشن : دو مترتھے ، ۱۳۶)

۲ــ نتیجے کا اثر کی غیر مادی شکل میں ظاہر ہونا :

الف - گزرے ہوئے کام کے اثرات موجودہ حالت میں محسوس ہوسکتے ہیں -

فعل کی تین قسموں کی جو باتیں پہلے نمبر کے استعمال میں کہی گئی ہیں وہ یہاں بھی پوری اترتی ہیں - جیسے

فعل متعدی ٭

« . . . . اس نے ہماری ناک کٹوائی ہے تو میں بھی اسے ٹھوکریں کھاتے دیکھنا چاہتا ہوں . . . . » (پریم چند : گؤدان ، ۲۵۱)

« مہتا نے ضد سے کہا ، تم نے مجھے اتنا سبک سمجھ رکھا ہے » (پریم چند : گؤدان ، ۵۵۵ ـ ۵۵۴)

. . . « تم نے اپنے کو سمجھا کیا ہے ؟ . . . » (پریم چند : گؤدان ، ۴۷)

« مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قمرن کے میاں کو کیا ہورہا ہے - یا اُسے سانپ سونگھ گیا یا جورو سے استعفا لے لیا ہے . . . » (سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ۳۴۵)

فعل لازم ٭

« بھلے آدمیوں کے ساتھ رہنے سے اس کی عقل کچھ جاگ اٹھی ہے » (پریم چند : گؤدان ، ۵۸۳)

« . . . . اس وقت ہوا خوب ٹھنڈی ہے - شاید کہیں مینھ برسا ہے » (سرشار : فسانہ آزاد ، جلد دوم ، صفحہ ۳)

« کہتے تھے تو سر چڑھ گئی ہے » (سدرشن : پاپ کے پتھ پر ، صفحہ ۱۵۲)

« وہ بدمعاش یہاں کے انسپکٹر سے خوب گٹھ گیا ہے » (سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ۵۰۰)

فعل ناقص ؛

«آج تم پر جوبن کہاں سے اس قدر پھٹ پڑا ہے» (سرشار : سیر کہسار، جلد دوم، ۳۴۰)

« نواب ۔ ہوش ٹھکانے میں ہیں ۔ ہمارے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں کہ یا اللہ اب کیا ہوگا » (سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ۳۹۲)

. . . « میں اندھکار میں بھٹک رہا تھا ۔ آج میری آنکھیں کھل گئی ہیں ۔ آج مجھے آتما کا اجالا مل گیا ہے » (سدرشن : دو ڈاکٹر ، ۲۹)

ب ۔ گزرے ہوئے زمانے کے کسی تجربے یا واقفیت کو ظاہر کرنے کے لئے حال تمام کا فعل استعمال ہوتا ہے ۔ جیسے :

« کیا ہوا اگر میں ایک کسان کا بیٹا ہوں ۔ میں تمہاری طرح شاعر نہ سہی ۔ لیکن آخر میں نے بھی گاؤں گاؤں کی خاک چھانی ہے ۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے ۔ صوبجاتی لیڈروں سے لےکر بڑے بڑے ہندوستانی لیڈروں کی تقریریں سنی ہیں ۔ تین بار جیل گیا ہوں ۔ میں کوئی بچہ تو نہیں » (کرشن چندر : اسکی خوشی ، صفحہ ۱۲۷)

محمودہ ۔ خیر کبھی حوض میں نہائی ہو ؟ » (نذیر احمد : بنات النعش ، ۱۱۸)

« تم نے اورنٹیل (مشرقی) زبانوں کی کتابیں اس کثرت سے پڑھی ہیں کہ اکثر جملے انہیں کے خیالات کی طرح بولتے ہو . . . » (سرشار : فسانہ آزاد ، جلد دوم ، ۳)

مندرجۂ بالا استعمالوں میں نفی کی موجودگی ماضی تمام اور حال تمام کا فرق نہیں کے برابر کردیتی ہے ۔ دونوں صیغوں میں فرق اتنا کم ہے کہ وہ آسانی سے محسوس نہیں ہوتا ۔ ماضی تمام کے صیغے سے کام کے نہ گزرے ہونے کا احساس زیادہ واضح ہوجاتا ہے ۔ حال تمام کے صیغے میں نتیجہ کی موجودگی اپنی خاص ظاہری صورت میں زیادہ شدت سے پائی جاتی ہے ۔ جیسے :

« سپہر — واہ کہیں روئی نہ ہوں ۔ روئیں میرے دشمن . . . » (سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد دوم* ، ۴۷)

---

* آنکھوں میں دھول مت جھونکو ! تم نے کچھ کہا نہیں تو یہ جھوٹ موٹ روتی ہے ؟ • پریم چند : گؤدان ، ۴۷

• ... ... ادھر جھنگری سے کہہ دیں گے کہ ابھی روپئے نہیں ملے » پریم چند : گؤدان ، ۲۹۸

• . معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شریفوں کی صحبت نہیں اٹھائی » (مرزا رسوا : امراؤ جان ادا ، ۹۷)

• ,,, ... اب میں اس لایق نہیں رہا جو کسو کی فرمائش پوری کروں » (مرزا رسوا : امراؤ جان ادا ، ۸۱)

« گو عمر میں ذرا یوں ھی سی بڑی ھو مگر نمکینی ابھی نہیں گئی ھے . . . . »
(سرشار : کامنی ، ۳۲۱)

« تحصیلدار کے لڑکے کی طرح اس قدر جنون نہیں ھوگیا ھے کہ جان دے ڈالے » (سرشار : کامنی ، ۳۲۰)

« گورا— کیا تم نے سرن لال کو کبھی نہیں دیکھا » ۔
« کامنی ۔ دیکھا تو ھے مگر دور سے اچھی طرح نہیں دیکھا ھے ۔ »
(سرشار : کامنی، ۳۱۵)

« . . . . یہ آپ ھی کے بڑے گہرے دوست اور عزیز ھیں جنھوں نے آپ کے تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ھے » (سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ۴۳۲)

نفی کے صیغوں میں فعل متعدی اور فعل لازم عام طور پر مفرد ھوتے ھیں ۔ جو کام عمل میں نہ آیا ھو اس میں امدادی فعل جوڑ کر زور پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ھوتی ۔

کبھی کبھی حال تمام اور ماضی تمام کے نفی کے صیغوں میں فرق کی یہ جھلک پائی جاتی ھے کہ اول سے کہنے والا اپنے آپ کو یا دوسرے کو کسی کام سے بری دکھانا چاھتا ھے اور دوسرا کسی سوال کا سادہ سا جواب ھوتا ھے ۔ جیسے :

« . . . . اگر اس نے ھتیا نہیں کی ھے تو گنگا جلی اٹھالے . . . . » (پریم چند : گؤدان ، ۱۸۰)

« . . . . تم نے اکیلے ھی تو سب کچھ نہیں کرلیا ھے ، میں بھی اپنی لڑکیوں کے ساتھ ستی ھوئی ھوں » (پریم چند : گؤدان ، ۲۱۲)

« . . . . آپ تو فتح پور سیکری گئے ھوں گے ؟ » ۔ « نہیں ابھی تو نہیں گیا »
(رانگیا راگھو : دھرتی میرا گھر ، ۱۰)

« آپ نے یہاں کے مشاعرے نہیں دیکھے ھیں » ۔ « جی نہیں دیکھے ۔ آج تک اتفاق نہیں ھوا » (سرشار : سیر کہسار ، جلد اول ، ۴۹)

حال تمام کے صیغے یہ نہیں ظاھر کرتے ھیں کہ کام کو ھوئے کم وقت گزرا ھے ۔ وقت کی قلت کا اندازہ جملے میں مناسب لفظوں کے ذریعہ ظاھر ھوتا ھے ۔ جس استعمال کی وجہ سے گرامر کی کچھ کتابوں میں حال تمام کو ماضی قریب کے نام سے

بھی یاد کیا جاتا ھے وہ دراصل نہیں ھے ۔ اس صورت میں بھی اھمیت اس بات کی ھے کہ کام کا نتجہ یا اثر بات کرتے وقت سامنے آجائے ۔ جیسے :

« دیکھا آپ بھی دھوکا کھاگئے نا ۔ میری عمر صرف چوبیس سال ھے ۔ پچھلے سال ھی تو بی اے کا امتحان دیا ھے » (عباس : اودھ کی شام ، ۷۵)

« ایسا لگتا تھاکہ نہ اسے مریض کی صحت کی فکر ھے اور نہ اس کا احساس ھے کہ ابھی ابھی اس نے اپنے نشتر سے کسی کی زندگی اور موت کا فیصلہ کیا ھے » (عباس : تیں تصویریں ، ۹۰)

« روح افزا نے کہا کہ باجی جان ابھی ابھی کہہ گئی ھیں کہ اماں جان نے قسم کھائی ھے کہ . . . » (سرشار : فسانہ آزاد ، جلد دوم ، ۲۵۷ ــ ۲۵۹)

« نازو ۔ وہ جو لڑکا آج کل نیا نیا نکلا ھے ، کھروا جو خوب ناچتا ھے اس کو بلواؤ » (سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ۴۵۹)

جب کام کا اثر یا نتیجہ باقی نہیں رھتا تو کام کو گزرے کتنا ھی کم وقت کیوں نہ ھوا ھو ماضی قبل ماضی کا استعمال کیا جاتا ھے ۔ جیسے :

« واہ ! آئے ھیں بڑے ڈرنے والے ۔ ابھی تو تم نے مجھے ڈرادیا تھا » (سدرشن : پتھروں کا سوداگر ، ۸۴)

۲ ۔ حال تمام سے کبھی کبھی یہ بھی ظاھر ھوتا ھے کہ کام بولنے کے وقت سے پہلے کس وقت ھوچکا ھے ۔ کہنے والا اسے حال ملاکر جملے میں « اب تک » یا « آج تک » کے مفہوم پوشیدہ کردیتا ھے ۔ کام کا نتیجہ موجود نہیں ھوتا ۔ جیسے :

« . . . . کبھی کبھی ایسا ھوا ھے کہ آلو کے کھیت سے آلو توڑ کے اسی دم بھنوائے اور گھوڑے ھی کی پیٹھ پر کھائے . . . . » (سرشار : کامنی ، ۱۲)

« آج مدت کے بعد ان بوڑھوں کو کبڈی کھیلنا نصیب ھوا ۔ بیشتر تو ایسے تھے جنھیں یاد بھی نہ آتا تھا کہ کبھی کھیلی ھے یا نہیں » (پریم چند : گؤدان ، ۲۳۰)

« اس سے پوچھو ، کبھی تو نے آرام کے درشن کئے ھیں ، کبھی تو چھاؤں میں بیٹھا ھے ؟ » (پریم چند ، گؤدان ، ۵۸۵)

« . . . . اے صاحب چاروں کونوں میں ایک دم سے آج تک کہیں بھی آگ لگتی ھے ۔ یہ کسی دشمن کا کام ھے . . . . » (سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد دوم ، ۱۰۱)

جو کام دیر تک یا بار بار ہوتا رہا ہے اس کا اظہار بھی حال تمام کے صیغے سے ہوسکتا ہے۔ مگر یہ مطلب حال تمام کے صیغے سے نہیں بلکہ جملے میں تمیز کے صرف ان لفظوں کو ملا کر نکلتا ہے جو کام کا بار بار ہونا یا دیر تک ہوتے رہنا دکھاتے ہیں - حال تمام کے استعمال سے کام کو بولنے کے وقت سے ملادیا جاتا ہے -

«.. سوچا کہ سال بھر پسینہ بہایا ہے تو ایک دن تاڑی تو پی لوں..»(پریم چند: گودان ۳۰۴)

«.... میں نے بھی ہمیشہ آپ کو اپنا بڑا بھائی سمجھا ہے اور اب بھی سمجھتا ہوں....» (پریم چند، گودان، ۳۸۵)

«... ان کئی مہینوں میں کتنا پچھتایا ہوں، کتنا نادم اور ملول ہوا ہوں، اس کا اندازہ شاید تم نہ کرسکوگی» (پریم چند: گودان، ۵۵۵)

«... یہ تو ہزاروں دفعہ آزمایا ہے» (سرشار: کامنی، ۵۲۴)

«میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ..» (مرزا رسوا: امراؤ جان ادا، ۲۴)

«یا اللہ جو اسی طرح عمر کٹ جاتی جس طرح اب تک کٹی ہے تو کیا بات ہے....» (سرشار: سیر کہسار جلد دوم ۳۶۹)

اس صورت میں جب فعل کے ساتھ «نہیں» استعمال ہوتا ہے تو ماضی تمام اور حال تمام دونوں کا استعمال ہوسکتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ دو صیغے معنی کے لحاظ سے ہمیشہ ایک جیسے ہیں۔ ماضی تمام کے ساتھ «نہیں» کا استعمال اکثر یہ دکھاتا ہے کہ کام ہوا ہی نہیں۔ «نہیں» پر زور دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ بھی کہ اس کام کے مستقبل میں ہونے کا بھی امکان نہیں ہے جب کہ حال تمام زمانہ ماضی کی نفی کرتا ہے مگر مستقبل میں اس کام کے ہونے کا امکان باقی رہتا ہے*۔

---

* «میں نے کبھی رشوت نہیں لی» (پریم چند، گودان، ۲۸۲)

«اونکار ناتھ کچھ نرم ہوکر بولے - جب کبھی ایسا موقع آیا ہے میں نے قدم پیچھے نہیں ہٹایا» (پریم چند: گودان، ۲۸۴)

آج تک آپ کا سا حسین جوان نظر سے نہیں گزرا» (سرشار: فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۲۲۰)

«... اب کسر بس یہ ہے کہ ہاتھ ابھی تک نہیں اٹھا» سرشار: فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۲۳۵)

«... ہم نے کبھی زخم کھائے اُف نہیں کی اور آگے ہی بڑھ گئے....» (سرشار، کامنی ۱۱)

پلائی آج جو رنگیں لبوں کے ساغر سے — کسی نے ایسی مئے تند و تیز پی ہی نہیں
یہ کہکشاں، یہ ستارے گواہ ہیں اے دوست — ترے علاوہ محبت کسی سے کی ہی نہیں
(تاباں: ایک رومان، ۱۴)

«.... اب کئی برس سے نہیں آئی - خدا جانے مرگئی یا جیتی ہے» (مرزا رسوا: امراؤ جان ادا، ۱۶۴)

حال تمام کے استعمال سے کام سے بری ہونے کا انکار کمزور ہوجاتا ہے۔ نفی کی شدت لفظ «اب» پر ہوتی ہے جیسے:

«مجھے تو مقدمہ لڑنے سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے آج تک مقدمے نہیں لڑے ہیں» (رانگیا راگھو: آخری آواز ۱۹۵)

«زینب — ایک طرح دیکھو تو سردی شروع ہوجانی چاہیے تھی۔ دو دن سے پروائی لو نہیں چلی ہے۔ نہیں تو دس بجے رات تک گرم ہوا پرسوں تک چلی» (سرشار: کامنی، ۲۰٤)

«کامنی نے میاں سے بڑا اصرار کیا کہ کل جس طرح ہو ہرن کا گوشت ضرور پکے، بہت دن سے نہیں کھایا ہے۔ کوئی سال بھر ہوا ہوگا» (سرشار: کامنی، ۲۰۵)

«نوجوان۔ ابھی نہیں مارا ہے، اب مارونگا۔ . . .» (پریم چند: دینداری، ۱۸۹)

۳۔ حال تمام ماضی کو حال بناکر پیش کرتا ہے۔ کسی زمانے میں گزرا ہوا کام اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ سننے والا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ختم ہوا دیکھ سکے حالانکہ کام کا نتیجہ بولتے وقت موجود نہیں ہوتا جیسے:

«میں شاید تمارے بچپن کا ساتھی ہوں۔ تمہارے لاپروا اور لاابالی بھائی کا دوست، تمہارے گیتوں کا لاجو۔ میں نے ندی کے نیلے پانی میں تمہارے ساتھ تیرتے ہوئے تمہارے سنہری بالوں کی چوٹی کو پکڑ کر یوں گھسیٹا ہے کہ تم بے اختیار چلا اٹھی ہو۔ تمہارے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دئے میں کئی بار بٹنگ کے درخت کے گرد ناچا ہوں اور آم توڑکر کھائے ہیں۔ ترناری کے پھولوں کا ہار بناکر ایک دوسرے کی گردن میں حمائل کئے ہیں - کئی بار جب چاند اخروٹوں کے جھنڈ کے پیچھے سے نمودار ہوا ہے میں نے چاندنی اور اندھیارے کی کانپتی ہوئی شطرنج پر تمہارا انتظار کیا ہے . تمہاری لچکتی ہوئی کمر میں ہات ڈالکر تمہارے کسمساتے ہوئے بدن کو اپنے سینے سے لگایا ہے» (کرشن چندر: حسن اور حیوان — ۲۵)

حال تمام

یہ صیغہ گزرے ہوئے کام کو بولنے کے وقت سے ملا دیتا ہے (فعل ناقص اور حالت دکھانے والے افعال مرکب ہوتے ہیں)

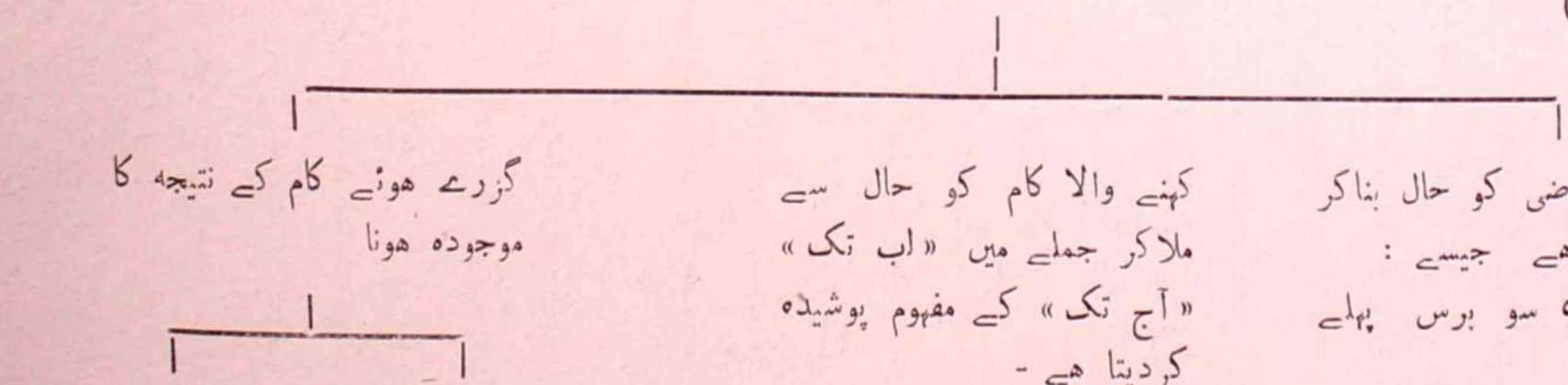

ماضی قبل ماضی

ماضی قبل ماضی کے تمام استعمالوں میں حالت دکھانے والے افعال (بیٹھنا) (لیٹنا) اور فعل ناقص عام طور پر مرکب ہوتے ہیں۔

«نظر آنا» «دکھائی دینا» «اچھا برا لگنا» «ایسا معلوم ہونا» جیسے افعال ناقص مرکب ہونے کی وجہ سے اپنی شکل نہیں بدلتے۔

کچھ فعل مثلاً «ملنا» «ہونا» کبھی کبھی مفرد اور مرکب دونوں صورتوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

فعل لازم اور متعدی کی مفرد اور مرکب دو شکلیں ہوسکتی ہیں۔ جہاں ان دو شکلوں میں معنی کے لحاظ سے فرق پایا جائیگا، یا کسی استعمال میں دو کی جگہ ایک استعمال ہوگی، وہاں اس کا ذکر کیا جائیگا۔

ماضی تمام کی یہ شکل ایسے کام کو ظاہر کرتی ہے جو ماضی میں کسی مقرر لمحے یا کسی دوسرے کام سے پہلے ہو چکا ہو۔ اس مقرر لمحے کو ہم مرکز زمانی سے تعبیر کرسکتے ہیں جو جملے یا پورے بیان سے کسی نہ کسی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ ہر ایک بیان کا اپنا مرکز زمانی ہوتا ہے۔ ماضی قبل ماضی کے بہت سے استعمالوں میں اس استعمال کو (کہ کام کسی مقرر لمحے سے پہلے ہوچکا ہو) بنیادی درجہ حاصل ہے اور یہ سب سے اہم ہے۔ اس بات کا اظہار کہ کوئی کام مرکز زمانی سے کسقدر پہلے ہوچکا ہے، مختلف طور پر ہوسکتا ہے۔ اس معنی میں فعل (متعدی اور لازم) کی صرف مفرد شکلیں استعمال ہوسکتی ہیں جیسے:

«ہوری کو اس ڈھلی ہوئی عورت میں بھی وہی نرم و نازک دل والی لڑکی نظر آئی جو پچیس سال پہلے اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی» - (پریم چند: گودان، ۱۹۹)۔

«رائے صاحب کانپ اٹھے۔ ان کے دل میں بھی اس طرح کی بات آئی تھی، مگر انہوں نے اسے کوئی صورت نہ پکڑنے دی تھی» - (پریم چند: گودان، ۵۳۱)۔

«اس نے جھنیا سے محبت اور وفا کی جو باتیں کہیں تھیں وہ سب یاد انے لگیں» (پریم چند: گودان، ۲۱۸)۔

جامنیں کھانے میں تینوں ایسے جٹے کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا (عصمت چغتائی: تین اناڑی، ۱۰)۔

ان جملوں میں ماضی قبل ماضی کے صیغے سے ظاہر کئے ہوے کام کا نتیجہ یا اثر بولنے کے وقت باقی نہیں رہتا - یہ استعمال ماضی قبل ماضی کو اس کے خالص معنوں میں ظاہر کرتا ہے -

ماضی قبل ماضی کے صیغے میں خود کوئی ایسا مفہوم پوشیدہ نہیں ہوتا جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ کام کئی بار ہوا یا دیر تک ہوتا رہا ہے - اس کے لئے جملے میں تمیز کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں - ماضی قبل ماضی تمیز کے ساتھہ مل کر یہ ظاہر کرسکتا ہے کہ کام مقرر لمحے سے پہلے کئی بار یا کچھہ وقت تک ہوا تھا جیسے :

« اس سمئے تک انھوں نے بہت سے سامان اور کئی کئی نوکروں کے ساتھہ سفر کیا تھا آج انکے ساتھہ کوئی سامان کوئی نوکر نہ تھا » (سدرشن: پتھروں کا سوداگر - ۱۸) -

« یہی گیت تھا جو رام‌پریا نے کتنی ہی بار دیوپریا کو گاتے سنا تھا » : (پریم چندر: پردۂ مجاز - ۳۷۲) -

ماضی قبل ماضی کے صیغے میں قبل ماضی کے ساتھہ کئی قسم کے معنی کی جھلک پائی جاتی ہے :

۱ــ گزرے ہوئے کام کا نتیجہ ماضی میں اس وقت موجود ہوتا ہے جس سے وہ ملا دیا جاتا ہے -

«دونوں اتنے خوش تھے گویا بیاہ کرکے لوٹے ہوں - ہوری کو تو اپنی دیرینہ خواہش کے پوری ہونے کی خوشی تھی اور وہ بھی بلا پیسے کے ! گوبر کو اس سے بھی زیادہ قیمتی چیز مل گئی تھی - اس کے دل میں بھی ایک سوئی ہوئی تمنا جاگ اٹھی » - (پریم چند : گودان ، ٤٠) -

« ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی ؟ چھتیسواں سال ہی تو تھا مگر سر کے سارے بال پک گئے تھے - چہرے پر جھریاں تھیں - جسم ڈھل گیا تھا - خوبصورت گندمی رنگ سانولا پڑ گیا تھا » (پریم چند : گودان ، ٦) -

« وہ صرف ایک پیلے رنگ کا کرتا پہنے ہوے تھے اور گلے میں ایک سفید چادر ڈال لی تھی » (پریم چند : پردۂ مجاز ، ٥٦)

اس صورت میں افعال متعدی اور لازم مفرد اور مرکب دو شکلوں میں استعمال ہوسکتے ہیں -

فعل متعدی اور لازم جب مرکب شکل میں استعمال ہوتے ہیں تو کام مقرر لمحے سے پہلے ہی عمل میں آچکا ہوتا ہے۔ مرکب فعل سے گویا نتیجہ کے موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے :

« ایک شخص کو پہلے ہی سکھا پڑھا رکھا تھا اس آگے بڑھکر آوازا کسا کہ »
(سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد اول ۔ ۱۰۹)

« مگر یہ چوٹ تو اس نازک جگہ پر تھی جہاں زندگی کی ساری رغبتوں کا اجتماع تھا۔ ایک آندھی تھی جس نے ان کی زندگی کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا تھا »۔
(پریم چند : گودان ۔ ۵۲۳)

« بدھو نفرگھر سے اپنے آقا کے پاس واپس آئے اور جو گفتگو پہلے چھوڑ دی تھی اس کو یوں از سر نو شروع کیا » (سرشار مترجمہ خدائی فوجدار تمہید۔ ۱۴)

« اب جہاز ڈوبنے ہی کو تھا۔ دس فٹ سے زیادہ پانی جہاز کے ہولڈ میں آگیا تھا »
(سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد دوم ۔ ۵۷)

بعض فعل لازم اور متعدی ایسے ہوتے ہیں جو حال تمام اور ماضی قبل ماضی میں صرف مرکب شکل سے کام کا گزرا ہونا دکھاسکتے ہیں جیسے :

« یہ گرما گرم فقرے ایک ایسے شخص کی زبان سے سنکر جس کے سبب یہ اس قدر مصیبت میں پڑگئے تھے ، انسپکٹر کا چہرہ مارے غصہ کے لال ہوگیا تھا »
(سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ۔ ۵۵۱)

« بھولا نے اس کے دل کی بات تاڑلی تھی۔ رکھائی سے جواب دیا . . . . »
(پریم چند : گودان ۔ ۲۰) ۔

مفرد فعل ایک ایسے قبل ماضی کو ظاہر کرتا ہے جو کسی حد تک غیر معین ہوتا ہے ۔

مندرجۂ بالا جملوں میں ساری توجہ کام کے نتیجہ پر جم جاتی ہے، قبل ماضی کے معنی پس منظر میں چلے جاتے ہیں ۔ ایسے جملوں کا مقابلہ ان جملوں سے ہوسکتا ہے جن میں یہ بات اس کے بر خلاف پائی جاتی ہے یعنی کام کے نتیجہ سے زیادہ قبل ماضی پر توجہ دیجاتی ہے جیسے :

« عید پر جو پتلون بنی تھی وہ ڈاٹی » (عصمت چغتائی : تین اناڑی ۔ ۷۹)

« ہر بلڈنگ نیچے سے اوپر تک روشنیوں سے جگمگا رہی تھی . . . روشنیاں جو اس نے یا اس جیسے دوسرے مزدوروں نے لگائی تھیں، جن کے لئے اس جیسے مزدوروں نے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈالی تھیں » (عباس : چراغ تلے اندھیرا ۔ ۵۳)

« نواب چھٹن صاحب کو ان کے ایک دوست نواب بڈھن صاحب جو اسٹیشن تک استقبال کے لئے آئے تھے، اسی وقت ہوٹل میں لے گئے » (سرشار : سیر کہسار ۔ جلد دوم ۔ ۴۳۱) ۔

« اس پر وہی بدذات چور دغاباز سوار تھا جس کو میں نے اور میرے آقا نے بچایا تھا » (سرشار : خدائی فوجدار ۔ تمہید ۔ ۸۵)

۲ــ ماضی قبل ماضی کے صیغے سے ظاہر کئے ہوئے کام اور بعد میں گزرے ہوئے کام یا حالت کے درمیان سبب کا تعلق ہوسکتا ہے ۔

« اور چونکہ اپلٹن کی جان آزاد نے بچائی تھی اسی سبب سے دونوں میاں بی بی کو ان سے ایک قسم کا عشق ہوگیا تھا » (سرشار : فسانۂ آزاد ۔ جلد دوم ۔ ۳۸)

« جان بچائی تھی » سے ہمیں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اپلٹن اس وقت زندہ ہے یا نہیں بلکہ یہ استعمال ہماری توجہ، محبت کی وجہ یعنی اولیت کی طرف منعطف کرتا ہے اور اس کا نتیجہ « عشق ہوگیا تھا » کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔

« نواب کے تیور اس وقت بہت برے تھے ۔ خانم کی باتوں نے نواب کے دل پر سخت اثر کیا تھا » (مرزا رسوا : امراؤ جان ادا ۔ ۸۲)

« من کو ایک پرسنتا بھی ہوئی کہ میں نے کیسی بات ڈھونڈ نکالی تھی ! » (رانگیا راگھو : دھرتی میرا گھر ۔ ۲۵)

« مالتی بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور بچہ یوں ہی رو رہا تھا ۔ شاید اس نے خواب دیکھا تھا، یا کسی اور وجہ سے ڈر گیا تھا » (پریم چند : گؤدان ۔ ۵۵۴)

« میں ایسی احمق ہوگئی تھی کہ جو وہ نگوڑا کہتا سو میں مان لیتی » (میر امن : باغ و بہار ۔ ۶۷)

اب تک ہم نے ماضی تمام کی ایسی شکلوں پر غور کیا کہ جن کا کام ماضی میں کسی مقرر لمحے سے پہلے گذر چکا ہو اور اس لئے اسے ماضی قبل ماضی کا نام دیا گیا ۔ لیکن بعض صورتوں میں ماضی قبل ماضی کے صیغے سے ظاہر کئے ہوئے کام کا حوالہ

ماضی کے کس مقرر لمحے سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعین حال سے (یا اس لمحے سے جسے حال سمجھا گیا ہو) ہوتا ہے - اس کے ذریعہ کئی کیفیتیں ظاہر کی جاسکتی ہیں -

۱ــ کام کو ختم ہوئے بہت عرصہ گزرا ہے -

اس استعمال کی وجہ سے ماضی قبل ماضی کو ماضی بعید کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے جیسے:

«. . . ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ اس ہندوستان نے فن تعمیر میں بھی علم وحدت اٹھایا اور کوس لمن اللکی بجایا تھا . . . .» (سرشار: سیر کہسار - جلد دوم - ۳۱۷)

«ایک وہ زمانہ تھا کہ اس ملک کے صناعان ہنرپرور نے ایسی عدیم السہیم عمارتیں بنوائی تھیں کہ آج تمام روے زمین پر ممتاز محل یعنی تاج بی بی کا روضہ اپنی نظیر نہیں رکھتا» (سرشار: سیر کہسار - جلد دوم - ۳۲۳)

«پنچو! آج تیں سال ہوئے میں نے سب جائداد اپنے بھانجے جمن کے نام لکھہ دی تھی . . . .» (پریم چند: پنچایت - ۲۳٤)

«آپ کــو یاد ہے، آپ نے پچھلے سال مجھے ایک وچن دیا تھا» (سدرشن: پتھروں کا سوداگر - ۱۵)

ماضی بعید کی بحث میں ہم جب وقت کے زیادہ گزرنے کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد صرف گھنٹے یا منٹ یا سال نہیں ہوتے بلکہ ہمارے احساس کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے -

«آزاد - (رستم جی سے) آپ نے افریقہ کی بھی کبھی سیر کی ہے -

رس - مرتے مرتے بچا

خ - وہ تو ہم سمجھے ہی تھے . . .» (سرشار: فسانۂ آزاد ــ جلد دوم ۸٦)

«. . . . بھلا ایسے تنک ظرف کو میں دل دیتی! کیا مجال - میں اس کی چتون ہی سے تاڑ گئی تھی کہ کھوٹا آدمی ہے . . .» (سرشار: فسانۂ آزاد - جلد دوم - ۲۲۸)

«مہراج، میں کیلاس ناتھہ ہوں»

«میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا» (سدرشن: سدا سکھہ - ۲۷۸)

۲ ــ کبھی ماضی تمام کی اس شکل سے محض یہہ معلوم ہوتا ہے کہ کام کا اثر یا نتیجہ ختم ہوچکا ہے - جیسے، پوچھا: «کون ہے وہاں کھڑا؟»

ھیرا بولا: «میں ھوں دادا، تمھارے الاؤ میں آگ لینے آیا تھا» (گؤدان - ۱۷۱)

«آیا ھوں» کے بجاے «آیا تھا» کا اس لئے استعمال ھوا کہ کہنے والا اپنے کام کو ختم کیا ھوا دکھانا چاھتا ھے۔

«اوہ — میں تو اس مہینے بھول ھی گیا تھا . . . .» (عباس: کچی کچی - ۸۲)

«لرزان - واہ! آئے ھین بڑے ڈرنے والے - ابھی تو تم نے مجھے ڈرا دیا تھا» (سدرشن: پتھروں کا سوداگر - ۸٤)۔

«نواب - اجی اس وقت بڑی کھل بلی مچ گئی تھی» (سیر کہسار جلد ۲، ۵۱٦)

«نواب مجھے تو بھائی صاحب پورا پورا یقین ھوگیا تھا کہ پولیس والے کلے پر آن موجود ھوئے . . .» (سرشار، سیر کہسار، جلد دوم، ۵۱٤)

«نازو - ھم تو سمجھے تھے منہ دیکھے ھی کی محبت ھے» (ایضاً - ۵۰۷)

یہ معنی زیادہ واضح طور پر اس وقت ظاھر ھوتے ھیں جب ماضی قبل ماضی کے صیغے سے ظاھر کئے ھوئے کام کا اس کام سے مقابلہ کیا جاتا ھے جو بعد میں عمل میں آیا ھو جیسے:

«یار کیا بتائیں ایک سونے کی چڑیا پھنس گئی تھی مگر نکل گئی ھاتھ سے . . .» (سرشار: سیر کہسار، جلد دوم - ۳۰۰)

«. . . اس کی حالت بہت خراب ھوگئی تھی، مگر اب کچھ سنبھل گئی ھے» (پریم چند: گودان - ۵۵۸)۔

«یہ وھی نازو ھیں جو اس وقت بیرسٹر کے قدموں پر گرپڑی تھیں اور حضور اور سرکار کہتی تھیں اور وھی نازو اب اس بیرسٹر کو لونڈا بناتی ھیں» (سیر کہسار جلد دوم ۳۷۱)۔

«جس سرور کو اس نے نایاب سمجھ رکھا تھا وہ اتنا قابل حصول اور اتنا قریب ھے» (پریم چند: گؤدان - ۵۵٦)

«ٹخنا کھسیا کر بولے جائیے! سوچا تھا کہ خوب کباب اُڑائیں گے سو آپ نے سارا مزا کرکرا کردیا . . .» (پریم چند: گؤدان - ۱۵۷)

«. . . آج نہ جاوگے تو کون ھرج ھوجائے گا؟ ابھی تو پرسوں گئے تھے» (پریم چند: گؤدان - ۵)

«آج ھی اس کے واستوک جیون کا آرمبھ ھوا تھا اور آج ھی یہ حال» (پریم چند : پریم کا ادئے - ١٣٩)

«. . . . ابھی پرسوں ھی ایک مقدمہ ھوا تھا . . . .» (فسانۂ آزاد - ج٢-١٠٨)

فعل کے اس استعمال میں کہ جہاں کام کو گزرے ھوئے کم وقت گزرا ھے ، فعل عام طور پر مفرد ھوتا ھے -

٣ــ ماضی قبل ماضی اس کام کو بتاتا ھے جو ماضی میں کسی دن یا تاریخ میں ھوا تھا اور جس کا ذکر بعد میں اسی دن یا تاریخ میں کیا جاتا ھے - اس مفہوم کو ظاھر کرنے کے لئے فعل کی مفرد شکلیں استعمال ھونگی - مثلاً

«آج پھر ایسو مرا تھا مگر اس کا شنکر کو اتنا غم نہیں تھا - ایسو تو بار بار مرتا ھے» (کرشن چندر : سب سے بڑا گناہ - ٤٤)

«امجد نے دھیمی آواز میں کہا : آج کے دن میری شادی ھوئی تھی - اس بات کو دس سال گزر چکے ھیں» (کرشن چندر : اسکی خوشی ، ١٢٢)

یہ خصوصیت دن اور تاریخ کے علاوہ مقام کے ساتھ بھی ھوسکتی ھے - جیسے :

«دس بارہ برس ھوئے کہ ایک فرانسیسی جہاز اس مقام پر غرق ھوا تھا . . . .» (سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد دوم ، ٥٩)

٤ - ماضی قبل ماضی کا صیغہ اکثر اس حقیقت کو دکھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ھے کہ کوئی کام عمل میں آیا اور اس کا تسلسل ختم ھوگیا - جیسے :

«جہاں سے تم گری تھیں وھاں سے کوئی مشکل سے ھی بچ سکتا ھے» (سدرشن : پتھروں کا سوداگر ، ٦٣)

«. . . . اس کو سمجھادو کہ عدالت میں یہ نہ کہے کہ میرے گالوں پر ھاتھ پھیرا تھا . . . .» (سرشار : سیر کہسار ، جلد دوم ، ٤٩٧)

«اور یہ تو روزانہ کا اصول بنالیا ھے جہاں ابا کے پیٹ پر بیٹھے اور شکایتوں کا دفتر کھل گیا ، فلاں نے مہنہ چڑایا تھا - ککو نے گھونسا دکھایا تھا - عذرا پروین نے گلاب کا پھول توڑا تھا - ٹیٹو نے مرغی کی دم کھینچی تھی -» (عصمت چغتائی : تین اناڑی ، ٦٧)

« خوجی اس وقت زمین پر قدم نہیں رکھتے تھے ۔ عمر بھر میں انھوں نے آج پہلی ہی مرتبہ ایک آدمی کو نیچا دکھایا تھا ۔ ٥ » (سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد دوم ، ١٥١)

٥ ۔ ماضی قبل ماضی کا صیغہ اس وقت بھی استعمال ہوتا ہے جب کسی دوسرے کے ساتھ باہمی تعلقات کا بیان کیا جارہا ہو اور بولتے وقت وہ آدمی زندہ نہ ہو یا پاس موجود نہ ہو یا اس کے ساتھ جو دوستی تھی وہ اب باقی نہ ہو ۔ مثلاً

« بچپن میں میں اور منی رام ساتھ ہی ساتھ پڑھے تھے ۔ بعد میں پریم کا ستھان ویر نے لے لیا » (سدرشن : گوی کی ستری ، ١٤٧)

« نہال کور کو یاد آیا ، اس کی سہیلی معصوم تھی . . . . بچپن سے دونوں کھیلی تھیں » (رانگیا راگھو : آخری آواز ، ١٥)

تمیزی جملوں میں ماضی قبل ماضی کا استعمال :

تمیزی جملے کے دونوں فقروں کے صیغوں کا فرق ہمیشہ کاموں کی ترتیب پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ پورے بیان کے مرکز زمانی میں یہہ فرق اکثر پوشیدہ ہوتا ہے ۔ کاموں کی ترتیب کی تین شکلیں ہوسکتی ہیں :

ا ــ ایک کام دوسرے سے پیشتر ہوچکا ہو ۔

ب ــ دونوں کام بیک وقت ہوئے ہوں ۔

ج ــ دونوں کام یکے بعد دیگر ہوئے ہوں ۔

تمیزی جملے کے صیغوں کے اس فرق کو نظرانداز کرکے ہم پہلے بیان میں مرکز زمانی کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اس مرکز زمانی سے تمیزی جملے کی صیغوں

---

*جن جملوں یا فقروں میں ماضی تمام کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اس کے سننے کے بعد ہم دوسرے جملے یا فقرے کو سننے کے منتظر رہتے ہیں یعنی گفتگو یا خبر کا تسلسل پہلے ہی جملے پر ختم نہیں ہوتا ۔ جیسے :

تب تو میاں آزاد جھلائے اور کس کر ایک لات لگائی ۔ خوجی کلبلاکر اٹھ بیٹھے تو طلاطم کا عالم دیکھا ۔ ہاتھ پاؤں سرد ہوگئے ۔ (سرشار : فسانۂ آزاد ، جلد دوم ، ٥٥)

. . . . ہم بھی آپ کی شکایت کردیں گے کہ آپ نے عجیب بھائی کے کتے کو ڈھیلا مارا تھا (عصمت چغتائی : تین اناڑی ، ٤١)

« آپ نے عجیب بھائی کے کتے کے ڈھیلا مارا » سے بات ختم ہونے کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ہم اس کے بعد کچھہ اور بھی سننے کے منتظر رہتے ہیں ۔

کا تعین کرتے ہیں۔ اگر تمیزی جملے کے کام بیان کے مرکز زمانی سے پہلے ہوچکے ہیں تو یہہ دونوں صیغے ماضی قبل ماضی میں ہوتے ہیں ۔ جیسے :

« اُدھر گوبر کھانا کھا کر اہیرن ٹولہ جا پہنچا۔ آج جھنیا سے اس کی بہت باتیں ہوئی تھیں۔ جب وہ گائے لے کر چلا تھا تو جھنیا آدھے راستے تک اس کے ساتھ آئی تھی »
(پریم چند : گؤدان ۔ ۷۳)

تمیزی جملوں کے اصل اور تابع فقروں میں ماضی قبل ماضی کا صیغہ اس وقت بھی استعمال کیا جاتا ہے جب ان کاموں کا ذکر ہو جن کو ہوئے بہت عرصہ گزر چکا ہے ۔ یا جن کو ایک بار کے واقعہ کے طور پر پیش کیا جائے ۔

« یاد ہے ان کی بھینس نے ذرا اشعر کے ابا کے پھول چرلئے تھے تو اسے کانجی ہاؤس بھجوا دیا تھا . . . . » (عصمت چغتائی : تین اناڑی : ٤٩)

« . . . . میں اگر اس وقت گھوڑے پر سے اترتا تو گھوڑا مجھے بہت دق کرتا۔ پھاٹک کے پاس میں ذرا اتر پڑا تھا تو اس نے نہایت پریشان کردیا تھا . . . . » (فسانۂ آزاد: جلد دوم ، ۷)

« جب ہم نے وہ پہلا خط لکھا تھا، ہم دونوں آٹھ آٹھ برس کے تھے » (عباس : بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام ، ٦٥)

ماضی قبل ماضی کا صیغہ صرف اصل فقرے میں استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ اس میں اصل اور تابع فقروں کے کاموں کی ترتیب نظرانداز کردی جاتی ہے اور کام کی قبل ماضی یا ایک بار گزرے ہوئے کی اہمیت سامنے آجاتی ہے ۔ جیسے

« جب وہ مرجھا گیا تو میں نے اسے اٹھاکر اپنے بکس میں رکھ دیا تھا »
(پریم چند : ابھلاشا ، ۹۵)

« . . . . جس دن اس نے میرے گھر پاؤں رکھا میں جھاڑو لے کر مارنے اٹھی تھی۔ مگر جب اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو گرنے لگے تو مجھے اس پر ترس آگیا» . . . . (پریم چند : گودان ، ۲۵۱)

جب تمیزی جملے کے گزرے ہوئے کاموں کو ماضی میں کسی مفرد لمحے سے نہیں ملایا جاتا یا ان کو ایک بار بغیر تسلسل کے گزرے ہوئے کاموں کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا تو ماضی قبل ماضی اور ماضی تمام کا استعمال اس طرح ہوتا ہے :

۱ــ ماضی تمام کا صیغہ تمیزی جملے کے دونوں فقروں میں تب استعمال ہوتا ہے جب کام ایک دوسرے کے بعد یا بیک وقت گزرے ہوتے ہیں۔ اصل اور تابع فقروں کے کام یکے بعد دیگرے ہوئے ہیں:-

«اور جب وہ چلاگیا تو اپنے ایک دوست سے مخاطب ہوکر بولا» . . . .
(عباس: کہتے ہیں جس کو عشق، ۲۰)

«جب بچوں کا شور کسی قدر کم ہوا تب جاکر بڑھیانے کنڈی کھٹکھٹا نے کی آواز سنی» ۔ ایضاً ٤٧

«جب ہر قسم کی سبزی سوکھ گئی تو سب نے گاؤں چھوڑ کر شہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔» ایضاً ۲۲

تمیزی جملوں کے اصل اور تابع فقروں کے کام بیک وقت ہوئے ہیں۔

«کنور صاحب نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو سب کچھ سمجھ گئے۔»
(سدر شن: پتھروں کا سوداگر، ۳٤)

کنور صاحب سب کچھ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کے بعد نہیں بلکہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے وقت سمجھ گئے۔

«اور اس رات جب میرے نرمل کی بانسری کی تان فضا میں گونجی اور آشا اس کے جادو بھرے آن دیکھے تاروں سے کھنچی ہوئی اپنے گھر سے باہر نکل آئی تو مجھے ایسا لگا کہ میرے فن کا تخلیقی مقصد پورا ہوچکا ہے۔» (عباس: کہتے ہیں جس کو عشق: ۱۵)

«. . . جب اس کالے کالے سنڈے کو دیکھا تو سن سے جان نکل گئی» (سرشار: فسانۂ آزاد، جلد دوم، ۳۱)

دو گزرے ہوئے کام صحیح معنوں میں بہ یک وقت نہیں ہوسکتے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ اصل فقرے کا کام تابع فقرے کے کام کے شروع ہونے کے بعد عمل میں آتا ہے۔

۲۔ ماضی قبل ماضی کا صیغہ تابع فقرے میں تب استعمال ہوتا ہے جب وہ اس کام کو دکھاتا ہے جس کا مرکز زمانی اصل فقرے کے مرکز زمانی سے بالکل الگ ہو، جب تابع اور اصل فقرے کے کاموں کے درمیان وقتی خلیج ہو۔

ایسے تمیزی جملے جن کے اصل اور تابع فقرے «جب» اور «تو» سے شروع ہوتے ہیں، مذکورۂ بالا قاعدے کے تحت نہیں آتے۔ مثلاً:

«انہیں وہ دن اب تک یاد تھا جب گیتا ایک دن چچا کی سختیوں سے عاجز آکر اسکول سے سیدھی ان کے گھر چلی آئی تھی اور ان کی گود میں گرکر اس بیقراری سے روئی تھی کہ صیفہ بیگم کی خود ہچکیاں بندھ گئی تھیں»۔ (صالحہ عابد حسین: راہ عمل، ۲۳۲)

۳۔ یہ دکھانے کے لئے کہ اصل فقرے کا کام تابع فقرے کے کام سے پہلے گزرا ہوتا ہے ماضی قبل ماضی کا صیغہ صرف اس شرط پر استعمال کیا جاسکتا ہے جب فعل مرکب ہو۔

«وہ جھونپڑی میں گئی، بجھی ہوئی آگ پھر جلائی، دیکھا تو گوشت ابل گیا تھا، کچھ جل بھی گیا تھا» (پریم چند: گؤدان، ۱۴۰)

«جب میں جاگا تو شام ہوچکی تھی، ہوٹل بھی جاگ اٹھا تھا۔ چاروں طرف ایک ہنگامہ سا بپا تھا» (کرشن چند: یورپ دیش ہے دلی، ۳۵)

ایسے تمیزی جملوں میں کہ جو «اس سے پہلے کہ» «اس سے قبل کہ» جیسی ترکیب سے شروع ہوتے ہیں، پہلے عمل میں آنے والے کام کے لئے ماضی قبل ماضی کا صیغہ عام طور سے استعمال نہ کرکے ماضی تمام کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے

«اس سے پہلے کہ وہ سارے بسکٹ چکھ ڈالتے، شہزادی اور شہنشاہ کی نظر وزیر اعلیٰ کی اس حرکت نازیبا پر پڑگئی» (عصمت چغتائی: تین اناڑی، ۱۶)

«اور اس سے پہلے کہ تینوں گتھ جاتے ادھر سے صوفی آپا بھٹکتی ہوئی آن پہنچیں» (عصمت چغتائی: تین اناڑی، ۴۱)

«مگر اس سے قبل کہ وہ چمڑا تھوک پاتے، کمی آپا نے بھوکی بلی کی طرح ان پر حملہ کردیا» (عصمت چغتائی: تین اناڑی، ۵۸)

ایسے جملوں میں دراصل ایک ہی فعل عمل میں آتا ہے جس کا مرکز زمانی بیان کے دوسرے فعلوں کے مرکز زمانی سے الگ نہیں ہوتا۔ اگر اس فعل اور بیان کے دوسرے فعلوں کا مرکز زمانی الگ الگ ہو تو ماضی قبل ماضی کا صیغہ استعمال میں آئے گا۔ ایسا بہت کم صورتوں میں ہوتا ہے۔

جو تمیزی جملے یہ دکھاتے ھیں کہ اصل فقرے کا کام تابع فقرے کے کام کے بعد ھی گزرا یا گزرنے لگا، ان میں تابع فقرے کا فعل، ماضی قبل ماضی اور اصل فقرے کا فعل، ماضی تمام کے صیغے میں ھوتا ھے۔ دونوں کاموں کے درمیان بہت کم وقفہ ھوتا ھے۔ ایسے تمیزی جملوں میں تابع فقرہ اصل فقرے سے « کہ » حرف وصل کے ذریعہ وابستہ ھوتا ھے - مثلاً

« سویرے گجردم تڑکے ذری آنکھ لگی تھی کہ مجھے جگایا »۔(سرشار : کامنی ، ۳۳۱)

« کامنی نے یہ فقرہ آدھا کہا تھا کہ چپ ھورھی »۔ (سرشار : کامنی ، ۳۱۸)

«آنکھ لگی ھی تھی کہ دروازےپر دستک ھوئی » (عصمت چغتائی : تین اناڑی ، ۷۸)

ایسے جملوں کے دو حصوں کے درمیان جو تعلق ھے اسے دیکھتے ھوئے کہا جاسکتا ھے کہ مندرجۂ ذیل جملے بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ھیں - جیسے

« میں اس بات کا کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ بوا حسینی جلدی سے اٹھ کے چلدیں » (مرزا رسوا : امراؤ جان ادا ، ۱۰٤)

«یہ جواب دینے بھی نہ پائے تھے کہ مہری اندر سے نکلی » (سرشار : سیرکہسار، جلد دوم - ۲۳۱ - ۲۳۰)

«دھنیا ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ وہ پھر چل دی» (پریم چند : گؤدان ، ۲٤٥)

اس مرکب جملے کے وقتی تعلق کی خاص کیفیت یہ ھے کہ وہ کام جس کے بارے میں جملے کے دوسرے حصے میں بتایا جاتا ھے ، اس کام سے پہلے ختم ھوتا ھے جو جملے کے پہلے حصے میں مصدر کے ذریعہ ظاھر ھوتا ھے -

ماضی قبل ماضی

(حالت دکھانے والے افعال اور فعل ناقص مرکب ہوتے ہیں)

- کام بولنے کے وقت سے ملایا جاتا ہے
  - اس حقیقت کو دکھانے کیلئے کہ کوئی کام عمل میں آیا اور اس کا تسلسل ختم ہوگیا : کل روئی کیوں تھی
  - کام ماضی میں کسی دن یا تاریخ میں ہوا تھا اور جسکا ذکر بعد میں اسی دن یا تاریخ میں کیا جاتا ہے : دسمبر کے انھیں دنوں میں میری بیوی بیمار ہوئی تھی
  - کام کا اثر یا نتیجہ ختم ہو چکا ہے : ابھی تم نے مجھے ڈرایا تھا
  - کام کو ختم ہوئے بہت عرصہ گزرا ہے : کئی سال ہوئے کہ آپ نے ایک وعدہ کیا تھا
- کام ماضی میں کسی مقرر لمحے سے ملایا جاتا ہے
  - سبب کا تعلق : اس نے میرے بھائی کی جان بچائی تھی اس لئے ہم اسے بہت چاہتے تھے
  - نتیجہ کا موجود ہونا : اس نے اپنی گردن دکھلائی جو سوج گئی تھی
  - فعل متعدی اور لازم مفرد شکل میں استعمال ہوتے ہیں : قبل ماضی اپنے خالص معنوں میں : اس نے جو باتیں کہی تھیں سب یاد آنے لگیں ۔

اقبال کا تصور تعلیم

از

ڈاکٹر غلام عمر خاں

شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

تعلیم کا مروجہ تصور :

تعلیم کے جدید تصور میں بالعموم نوجوانوں کی ذہنی، اور کسی حد تک جسمانی تربیت کا مفہوم شامل ہے[1]۔ قدیم تمدنوں میں تعلیم مذہبی پیشواؤں کی نگرانی میں دی جاتی تھی، اور عام نہیں ہوا کرتی تھی ۔ تعلیم کے نئے دور کا آغاز یونانیوں کے عہد سے ہوتا ہے، جنھوں نے ذہن انسانی کو قدیم توہمات سے آزادی دلانے میں بڑا حصہ لیا، اور انسانی فکر پر عمیق اثرات چھوڑے ۔ یونانی تعلیم کا اثر اہل روما کے تعلیمی نظام پر ہوا، اور اس طرح عہد وسطیٰ، اور موجودہ دنیا تک اس کے اثرات پہنچے ۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں یورپ میں نشاۃالثانیہ کے ساتھ تعلیم کو زبردست ترقی ہوئی، اور متعدد جامعات اس زمانے میں قائم ہوئیں ۔

لیکن تعلیم کے موجودہ دور کا آغاز اُنیسویں صدی سے ہوتا ہے، جب کہ مملکت نے تعلیم کا ذمہ لیا ۔ تعلیم کو عام بنایا گیا، اور مملکت کے غیر مذہبی تصور کے پیش‌نظر تعلیم کو بھی غیر مذہبی حیثیت دی گئی ۔ عورتوں کے لئے بھی وہی تعلیم تجویز ہوئی جو مردوں کے لئے تھی ۔ اور متعدد نئے مضامین جو سائنسی اور صنعتی ترقی کا نتیجہ تھے، تعلیم کے نصاب میں شامل کئے گئے ۔ رفتہ رفتہ تعلیم نے یورپ میں قوموں کی رہنمائی کرنے والی قوت کی حیثیت سے، مذہب کی جگہ حاصل کرلی ۔

عہد حاضر کے مشہور امریکی ماہر تعلیم جان ڈیوی کے نزدیک تعلیم کا مقصد مملکت یا جماعت کے مفاد کی خاطر، جماعت کی سرگرمیوں میں دانشمندانہ حصہ لینے والے

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف ماڈرن ایجوکیشن (ایجوکیشن)

شہری پیدا کرنا ہے[1] - روسو کے الفاظ میں انسان سماجی حیوان ہے، سماج کے بغیر فرد کی زندگی دشوار ہے، اس‌لئے انسان کو سماجی زندگی کے قابل بنانا، تہذیبی نقطۂ نظر سے تعلیم کا مقصد ہے - پھر سماج کے ایک خود مکتفی اور آزاد رکن کی حیثیت سے، فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی ذریعۂ معاش اختیار کرے، اس‌لئے جدید تعلیم افراد کی فنی اور پیشہ‌ورانہ تعلیم (Technical & Vocational Education) کو بھی اپنا مقصود قرار دیتی ہے - بلکہ جدید ترین رجحان یہ ہے کہ محض تہذیبی (Cultural) تعلیم، چونکہ افراد کی معاشی خوش حالی کی ضمانت نہیں دے سکتی، اس لئے دوران تعلیم میں تہذیبی پہلو کے مقابلے میں، فنی اور پیشہ‌ورانہ پہلو پر ابتدا ہی سے زور دیا جائے - جدید تعلیم کا تہذیبی منتہا، اعلیٰ اور نصب‌العینی سیرتوں کی تخلیق کرنا نہیں، بلکہ نوجوانوں کو مملکت کے دوسرے شہریوں کے ساتھ مل کر، سماجی زندگی گزارنے کے قابل بنانا ہے، اس طرح کہ وہ معاشرہ میں رہ‌کر، معاشرے کو نقصان پہنچائے بغیر خوش حالی کی زندگی گزار سکیں، اور اپنی صلاحیت کے مطابق معاشری زندگی کے مختلف شعبوں کو آگے بڑھانے میں حصہ لے‌سکیں -

مغرب کا یہ جدید تصور تعلیم، جو مغرب کے زیر اثر عہد حاضر کے دوسرے تمام متمدن ممالک میں رائج ہے، اقبال کے نزدیک مغربی معاشرہ کے دیگر اداروں کی طرح انسان کی مادی ہستی کو اپنا بنیادی معروض (Object) قرار دیتا ہے - جیسا کہ صراحت کی گئی، فرد کی ذہنی اور کسی حد تک جسمانی تربیت، اس‌کو سماجی زندگی کے قابل بنانا، معاشی مسئلہ کے حل کے لئے اس‌کی فنی اور پیشہ‌ورانہ تربیت، غرض مملکت کے لئے ایک خود مکتفی اور پسندیدہ شہری پیدا کرنا اور مملکت کے سانچے میں اس کو زیادہ سے زیادہ انطباق پیدا کرنے کے قابل بنانا، تعلیم جدید کے اساسی مسائل میں شامل ہیں -

تعلیم جدید اور انسان کا اعلیٰ نمونہ:

تعلیم کا یہ تصور، انسانیت کے ان عظیم‌المرتبت معلمین (Educators) کے نزدیک عامیانہ (Mediocrite)، بلکہ مریضانہ ہے، جو انسان کے ایک اعلیٰ اور برتر نمونے کی پیدائش کو عالم بشریت کے موجودہ مصائب کا علاج، اور طبع انسانی کے موجودہ انحطاط

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف ماڈرن ایجوکیشن - (ڈیوی جان)

و زوال کا درماں تصور کرتے ھیں - اس خصوص میں عہد حاضر کے دو جلیل القدر معلمین اقبال اور نٹشے کے خیالات میں بعض ضمنی اختلافات کے باوجود بڑی ھم آھنگی پائی جاتی ھے -

اقبال کے نزدیک تعلیم و تربیت، فرد کی سیرت کی تشکیل میں نہایت اھم حصہ ادا کرتی ھے - بلکہ یہ کہنا درست ھوگا کہ اقبال کے نقطۂ نظر سے، خودی کی پوشیدہ توانائی کی مکمل کشادگی اور نمود، بالکلیہ تعلیم و تربیت کے تابع ھے -

انسانی موناد کی تاثر پذیری:

لائیبنز کا خیال تھا کہ تمام مونادات (Monads) فعلیت کے آزاد مراکز ھیں، اور ایک دوسرے پر اثرانداز نہیں ھوتے - البتہ تمام مونادات کے اندرونی تغیرات کی ازل میں کچھ اس طرح تقدیر کی گئی ھے، کہ وہ متصلہ موناد کے تغیرات سے ھم آھنگی اختیار کرلیتے ھیں - چنانچہ انسانی موناد بھی لائیبنز کے نزدیک، اپنی خصوصیات کے اعتبار سے دوسرے انسانی مونادات سے منفرد اور غیر تاثرپذیر فطرت کا حامل ھوتا ھے - لیکن اقبال اس خصوص میں لائیبنز سے اختلاف کرتے ھیں - اقبال کے نزدیک تاثرپذیری انسانی موناد کی ایک اھم خصوصیت ھے اور تاثرپذیری ھی میں خودی کے پوشیدہ امکانات کی کشود کا راز مضمر ھے - اپنے ایک خط میں اقبال لکھتے ھیں:

> «اس کے (لائیبنز کے) قیاس کے مطابق انسانی موناد خارج سے کوئی شے قبول کرنے سے عاری ھے - میرا خیال یہ ھے کہ انسانی موناد زیادہ تر تاثرپذیر نوعیت کا حامل ھے - زمانہ ایک بڑی ھی برکت اور نعمت ھے، اگر ایک طرف موت اور تباھی لاتا ھے، تو دوسری طرف وقت ھی آبادی اور شادابی کا منبع ھے - یہی اشیاء کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لاتا ھے - حالات حاضرہ میں تغیر کا امکان ھی انسان کی سب سے بڑی دولت اور ساکھ ھے»[1]

غرض اقبال کے نظریۂ تعلیم میں انسانی موناد کی تاثرپذیری کے تصور سے، سیرت انسانی کی تشکیل میں، تعلیم و تربیت کے ادارے کو اساسی حیثیت حاصل ھوجاتی ھے -

نسل اور خون کے اثرات، نٹشے کی نظر میں:

اقبال کے برخلاف نٹشے انسانی موناد کی اصل پر زور دیتا ھے - نٹشے کے

---

(۱) مکاتیب اقبال ص ۳۱۶

نزدیک تعلیم کی اثرانگیزی ، نسل اور خون کے اثرات کو زائل نہیں کرسکتی ۔ فاسد اور مریضانہ (Decadent) خون کا حامل انسان ، اگر کوئی عظیم کام انجام دے بھی، تو اس کا یہ کارنامہ نوع انسانی کے حق میں صحت اور ارتقا کی طرف لےجانے والا نہیں ، بلکہ انحطاط و زوال کی طرف رہبری کرنے والا ثابت ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر ایک فاسد خودی (Decadent ego) میں دھماکے کی پیدائش ، نٹشے کے الفاظ میں « خاتون اعظم » کی پیدائش کا باعث ہوسکتی ہے[1] ۔ ماحول اور تعلیم و تربیت ، موروثی اثرات کو کہاں تک زائل کرتے ہیں ، اور موروثی اثرات تعلیم و تربیت کے باوجود ، کس حد تک سیرت پر اثر انداز ہوتے ہیں ، یہ تعلیم کا ایک معرکۃالارا اور متنازع‌فیہ مسئلہ ہے ۔ لیکن بہرحال یہ امر واقع ہے کہ جدید علوم انسان کو ذہنی آزادی بخشتے ہیں، اور اس امر کا ہر طرح امکان ہے کہ تعلیم کی عطا کردہ حریت سے مسلح ہونے کے بعد ، ایک دماغ مریضانہ اور فاسد راہوں پر گامزن ہوجائے ، اور دوسرا اسکی برعکس سمت میں ۔

آزادی فکر اور خام انسان :

اقبال کا تصور تعلیم جو اسلامی بصیرت سے فیض‌یاب ہے ، ذہن انسانی کو محض حریت عطا کرکے ، اس کو آزاد چھوڑ دینے تک محدود نہیں ، بلکہ نفی اقدار (Negation of values) ، یا اقبال کے الفاظ میں « لا » کی آزادی بخش قوت کے بعد ، قدروں کے ایک مخصوص نظام کے اثبات کو لابدی گردانتا ہے ، اور اس طرح انسانی دل و دماغ کی فاسد راہوں پر بھٹکنے کے امکانات کو خارج کردیتا ہے ۔ اقبال کے نزدیک تعلیم و تربیت کا مقصود ، محض ذہن انسانی کو آزاد کرنا نہیں ، بلکہ اقدار حیات کے ایک اعلیٰ نظام کو انسانی شخصیت پر اس درجہ مسلط کردینا ہے ، کہ آزادی فکر کے پیدا ہونے کے بعد ، خام انسان کے ، ہلاکت کے راستے پر جاپڑنے کے امکانات ختم ہوجائیں ۔

تعلیم جدید جو ذہن انسانی کو آزادی بخشتی ہے ، فاسد طبائع (Decadent natures) یا قرآن کے الفاظ میں « قلوب مریض » کو مزید انحطاط و زوال کے راستے پر ڈال دیتی ہے ۔ ان اشعار مین اقبال اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہے فکر اگر خام تو آزادی افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

(۱) نٹشے کے خیال کے مطابق « یہ ضروری نہیں کہ ایک عظیم انسان مرد بھی ہو، ہوسکتا ہے وہ صرف ایک عووت ہو ، مثلاً یسو مسیح »

تعلیم کے اسی پہلو کے پیش نظر، نٹشے کا خیال تھا کہ آزادی فکر، رو بہ زوال اور فاسد طبائع میں پہنچ کر، «خاتون اعظم» یا اسی قبیل کے انسان پیدا کرتی ہے، جو نوع انسانی کو پیچھے کی طرف گھسیٹتے ہیں - اس لئے وہ اعلی تعلیم کو خواص یا اشراف کے لئے محدود رکھنے کا مدعی ہے[1]- نٹشے کے اس اندیشے سے اقبال کو بھی اتفاق ہے کہ آزادی فکر، ایک «قلب مریض» یا فاسد طبیعت میں پہنچ کر انسان کو حیوان نہ بنادے - لیکن اقبال کا تصور تعلیم انسان کو محض آزادی فکر کی منزل پر نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ اثباتی قدروں کے ایک ایسے نظام کو انسانی خون میں سرایت کردیتا ہے، جس کی بدولت «خاتون اعظم» نہیں، بلکہ «انسان اعظم» ہی پیدا ہوسکتے ہیں - تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کی مخصوص تہذیب جب غلاموں اور نچلے طبقے کے انسانوں کے خون میں بھی سرایت کر گئی ہے، تو ان سے بھی عظیم الشان مردانہ کارنامے ظہور میں آئے -

تعلیم کا مقصد، اقبال اور نٹشے کی نظر میں :

ایک مخصوص تہذیب کا انسانی شخصیت پر مسلط کردیا جانا، ایک مخصوص تہذیب کا انسانی خون میں سرایت کرجانا—یہی اقبال اور نٹشے دونوں کے نزدیک تعلیم کا نصب العین ہونا چاہئے - اور یہ نصب العین، جامعات کے اساتذہ اور کتب خانوں کی مدد سے عملی جامہ پہن سکتا ہے، اور نہ بچے کی ابتدائے عمر سے، فروبل اور مانٹی سوری کے تعلیمی طریقوں کے ذریعہ جو تربیت دی جائے، اسکی مدد سے - اس مقصد کی تکمیل کے لئے، نٹشے اور اقبال دونوں کے نزدیک صرف عظیم شخصیتیں درکار ہیں - ایسی شخصیتیں جن کے لطائف کی کشش، ہر چیز کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے، اور جن کی صحبت سے ہر خس و خاشاک کیمیا بن جاتا ہے - ایسے عظیم المرتبت معلمین ہی قوموں کی تقدیر بناتے ہیں - ملت میں ایسی ایک جلیل القدر شخصیت کی موجودگی بھی، اسکے نوجوانوں پر راز حیات افشا کرجاتی ہے -

مروجہ نظام تعلیم، نٹشے کی نظر میں :

گذشتہ صدی میں جرمنی کے نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے نٹشے ایسے ہی عظیم معلمین کے فقدان کو اس نظام کی بنیادی خامی قرار دیتا ہے، اور یہی اسکے نزدیک جرمن تہذیب کے انحطاط و زوال کا سبب ہے - جرمنی کے نظام تعلیم کے کھوکھلے پن پر

(۱) نٹشے، ٹوائی لائیٹ آف دی آئیڈاز ص ۵۶

نٹشے کی یہ تنقید عہد حاضر کے مروجہ تمام نظام ہائے تعلیم پر بھی بعینہ صادق آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے :

« ہر وہ چیز جو اہمیت رکھتی ہے، جرمنی کے اعلیٰ تعلیمی نظام میں نظرانداز کردی گئی ہے، خواہ وہ مقصد ہو، یا مقصد کے حصول کے ذرائع ۔ لوگ یہ فراموش کردیتے ہیں کہ تعلیم—تہذیب و تربیت کے طریق عمل کی حیثیت سے ۔ بجائے خود ایک مقصد ہے، نہ کہ « مملکت »—وہ یہ فراموش کردیتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے « معلم » (Educator) درکار ہے، نہ کہ پبلک اسکول کا مدرس، اور جامعہ کا عالم ۔ ایسے « معلمین » جو خود اعلیٰ تہذیب کے علمبردار ہوں، فائق اور رفیع الشان دماغ، جو یہ ثابت کرسکیں کہ وہ حقیقت میں ان خوبیوں کے حامل ہیں، اور اپنی زندگی کے ہر لمحے میں اپنے قول اور اپنے رجحانات میں تہذیب کی پختہ اور رسیدہ پیداوار ہیں، نہ کہ تعلیم یافتہ گنوار، یا ناتراشیدہ عالم، جو آج کل ملک کے نوجوانوں پر اعلیٰ اناؤں کی طرح، پبلک اسکولوں اور جامعات کی طرف سے مسلط کردئے جاتے ہیں ۔ کمیاب مستثنیات کو چھوڑکر وہ شے جو جرمنی میں مفقود ہے، وہ تعلیم کی شرط اولین ہے—یعنی « معلمین »—اور یہی علت ہے جرمن تہذیب کے انحطاط و زوال کی . . . جرمنی کے اعلیٰ مدارس جو کام انجام دے رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کے ایک وسیع مجمع کو ممکنہ کمترین وقت میں، بےحسی اور اجڈپن سے تربیت دیتے ہیں، تاکہ وہ مملکت کے لئے مفید اور قابل استحصال خادم بن سکیں »[1] ۔

جوہرخودی کی کشادگی، ارر اثباتی قدروں کی اہمیت :

نٹشے کی طرح اقبال بھی مملکت کے لئے مفید اور خدمت گزار خادم پیدا کرنے کو، تعلیم کا ایک ادنی نصب العین سمجھتے ہیں ۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد ایک ایسی قوی تہذیب کا رگ وریشے میں سرایت کرجانا ہے کہ انسانی جوہر (Humanation)

(١) نٹشے : ٹوائی لائٹ آف دی آئیڈلز ص ٥٥

میں دھماکا پیدا ہوسکے ، اور شخصیت کے پوشیدہ ممکنات کی مکمل نمود عمل میں آئے ۔اور یہ مقصد مدرسوں اور جامعات کے موجودہ تعلیمی نظام سے پورا نہیں ہوسکتا ۔ موجودہ تعلیم ایک حریت بخش قوت کی حیثیت سے ، عقل کو آزاد تو ضرور کرجاتی ہے ، جو درحقیقت نفی اقدار ، یا « لا » کی منزل ہے ، لیکن نفی اقدار کی منزل کے بعد قدروں کے کسی قوی نظام کے اثبات کے ذریعہ ، وہ منتشر اور پریشان افکار کی ترکیب کا کوئی سامان نہیں کرتی ۔ قدروں کے ایک قوی نظام اثبات کے بغیر انسان کے قوی ذہن و عمل کی شیرازہ بندی نہیں ہوسکتی ، اور شخصیت کے منتشر قویٰ تخلیقی قوت پیدا نہیں کرسکتے ، جو سوز عشق کی بدولت ممکن ہے[1] ۔ « ضرب کلیم » میں اقبال نے تعلیم و تربیت کے عنوان کے تحت جو اشعار لکھے ہیں ، ان میں عصر حاضر کے تعلیمی نظام کی اسی خامی کی طرف اشارہ کیا ہے :

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لا دینئی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطئی افکار سے مشرق میں غلام

علوم جدید میں قوت محرکہ مفقود ہے :

علم و حکمت کی روشنی دماغ کو منور تو ضرور کردیتی ہے ، لیکن اس میں وہ قوت محرکہ (Dynamic force) مفقود ہے ، جو انسان کو خود اعتمادی اور خودآگاہی ، اور غیر متزلزل یقین کے ساتھ ماحول پر حملہ آور ہونا سکھاتی ہے ، اور جو شخصیت کے تمام تر قویٰ کو ایک بنیادی نصب العین پر مرکوز کرکے ، جوہر خودی مشتعل کرنے کا باعث ہوتی ہے ۔ اس کے بغیر انسان ، ذات کے حقیقی کیف و سرور سے ناآشنا رہتا ہے ۔ لیکن جوہر خودی کی کشادگی ، موجودہ تعلیمی نظام میں ، جامعات کے کتب خانوں اور اساتذہ کے ذریعہ ممکن نہیں ۔ اس کے لیے سوز عشق درکار ہے ، جو ایک صاحب عشق

---

[1] اقبال کے تصور عشق پر راقم کا ایک تفصیلی مضمون « فکر و نظر » جنوری سنہ ۱۹۶۴ع کے شمارے میں شائع ہوا ۔

یا مرد کامل کی فیض صحبت کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا ۔ « ضرب کلیم » میں « تربیت » کے عنوان کے تحت ، اقبال اسی حقیقت کی صراحت کرتے ہیں :

زندگی کچھ اور شی ہے ، علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہل دانش عام ہیں ، کمیاب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

عظیم معلم یا مرد کامل نظام تعلیم کی روح رواں ہے :

نٹشے کی طرح اقبال بھی ، ایک عظیم معلم، ایک عظیم الشان حرکی (Dynamic) شخصیت کو ، سارے تعلیمی نظام کی روح سمجھتے ہیں ۔ اس کے بغیر کسی قوم کا تعلیمی نظام ، اپنی جامعات، اساتذہ، کتب خانوں، معملوں، مدرسوں ، بازی گاہوں، اور طفل تربیت گاہوں (Nursery School) کے باوجود محض بے جان رہتا ہے ۔ اقبال طالب علم کی زندگی میں اِسی زبردست کمی کے پورا ہونے کی تمنا کرتے ہیں ، کیونکہ ایک حرکی شخصیت کے فیض ہی کی بدولت خودی کی بیداری ممکن ہے ، جو تمام قوت تخلیق کا سرچشمہ ہے :

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں مگر صاحب کتاب نہیں

ذیل کے اشعار میں بھی اقبال نے ایک معلم (Educator) کی حیثیت سے ، مرد کامل کی حرکی شخصیت کا نقشہ کھینچا ہے، جو ایک قوی تہذیب کی تخم ریزی کے ذریعہ، انسانی دل و دماغ میں ایک برتر اور اعلیٰ نمونے کی تخلیق کا باعث ہوتی ہے :

پختہ سازد صحبتش ہر خام را تازہ غوغاے دھد ایام را
از نم او آتش اندر شاخ تاک در کف خاک از دم او جان پاک
از نگاہش فرودیں خیزد ز دی درد ہر خم تلخ تر گردد ز می
درس لاخوف علیھم می دھد تا دلے در سینۂ آدم نہد

صحبت او هر خزف را دُر کند　　حکمت او هر تہی را پُر کند
بندۂ درمانده را گوید که خیز　　هر کہن معبود را کن ریز ریز
ذرۂ بے مایه ضو گیرد ازو　　هر متاعے ارج نو گیرد ازو
زنده از یک دم دو صد پیکر کند　　محفلے رنگیں ز یک ساغر کند
تازه انداز نظر پیدا کند　　گلستاں در دشت و در پیدا کند
از تف او ملتے مثل سپند　　برجهد شورا فگن و هنگامه بند
یک شرر می افگند اندر دلش　　شعلۂ درگیر می گردد گلش
بندها از پا کشاید بنده را　　از خداوندان رباید بنده را

اهل دل از صحبت ما مضمحل　　گل ز فیض صحبتش دارائے دل
محرم او شو ز ما بیگانه شو　　خانه ویراں باش و صاحب خانه شو
شکوه کم کن از سپهر لاجورد　　زنده شو از صحبت آں زنده مرد
صحبت از علم کتابی خوشتراست　　صحبت مردان حر آدم‌گر است

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو　　لاکھوں میں ایک بھی ہوا گر صاحب یقیں

پرورش دل کی اگر مدنظر ہے تجھ کو　　مرد مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس
دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت　　ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

خودی کی بیداری، تعلیم کا بنیادی مقصد ہے :

اقبال کے نقطۂ نظر سے تعلیم کا بنیادی مقصد، خودی میں جذبۂ عشق کی بیداری اور اس کی تربیت ہے یعنی اس بنیادی جذبۂ حیات کا جھنجوڑ کر بیدار کردیا جانا، جو انسان کی تمام تر مساعی کا اساسی محرک ہے ۔ جیسا کہ اقبال کے تصور عشق کی توضیح کرتے ہوئے راقم نے صراحت کی ہے، عشق سے اقبال کی مراد انسانی شخصیت کے حقیقی جوہر، روح کا خلش و اضطراب ہے، اور جو اپنی اصل، خودی مطلق، کی طرف عود کرنے کی آرزو پر مشتمل ہے ۔ انسان کی مادی ہستی، روح کے مقصود کی تکمیل، یعنی خدا کا تقرب حاصل کرنے کی جد و جہد میں، ایک ذریعہ یا آلہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔

اس لئے زندگی کے تمام اداروں کا مقصد ، جن میں تعلیم بھی ایک اہم ادارہ ہے ، یہی ہونا چاہئے کہ وہ روح کو اس کی بنیادی جستجو میں مدد دیں ۔

تعلیم جدید کا معروض انسان کی مادی ہستی ہے :

اقبال کے اس تصور کے برعکس ، تعلیم جدید کا مقصد انسان کی ذہنی اور کسی حد تک جسمانی تربیت ہے۔ بالفاظ دیگر تعلیم جدید کا معروض انسان کی مادی ہستی ہے۔ ذہن یا عقل اقبال کے نزدیک انسان کی مادی ہستی کی پیداوار ہے ۔ وہ ایک حربہ ہے جس کی تشکیل انسان کی مادی ہستی نے موجودہ ماحول میں اپنی حفاظت و بہبود کی خاطر کی ہے ۔ اس طرح جدید تعلیم انسانی شخصیت کے صرف ایک جز کو جس کا تعلق شخصیت کے ادنیٰ جوہر (Lower Principle) سے ہے ، اپنا بنیادی معروض اور منتہا قرار دیتی ہے ۔

طبعی علوم قرآن کی نظر میں :

اقبال عقل یا ذہن انسانی کی نشو و نما اور تربیت کو بھی تعلیم کے مقاصد میں سے ایک ضروری مقصد تصور کرتے ہیں ۔ قرآن کے نزدیک علم ، انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے ۔ اشیا کے تغیرات کا علم ، ذات مطلق کے شیون ، یا اسمائے الٰہی کا علم ہے ، اور اقبال کے نزدیک یہ عبادت کی ایک شکل ہے ۔ تغیر کا عالمگیر ظہور (Phenomenon) قرآن کے نزدیک خدا کی سب سے بڑی نشانی ہے اور قرآن غوروفکر کرنے والوں کو خدا کی ان نشانیوں کے سمجھنے کی ترغیب دیتا ہے[1] ۔ اشیا کے تغیرات کا علم ، طبعی علوم (Physical Sciences) کی تحصیل ہے ۔ لیکن علوم عقلیہ یا علوم طبعی کے ذریعہ صرف حقیقت کے مجازی پہلو تک رسائی ممکن ہے ، حقیقت کے باطنی پہلو کا ادراک طبعی علوم کے ذریعہ نہیں ہوسکتا ۔ یہ صرف مذہبی تجربے یا قلبی تجربے کی بدولت ممکن ہے ، جو حیات کی اعلیٰ تر سطحوں کا تجربہ ہے ۔ اس تجربہ میں عارف ایک واحد اندرونی نظر کی تخلیق کے ذریعہ ، اعماق حیات میں غوطہ لگاکر ، حقیقت کے عین یا اسکے باطنی کیف و سرور کا حیات انگیز تجربہ حاصل کرتا ہے ۔ اقبال ایک عارف

---

۱ ملاحظہ ہوں قرآن، سورہ بقرہ آیت ۱۶۴ ، سورۃ الانعام آیات ۹۹ ، سورۃ الغاشیہ آیات ۱۸ تا ۲۰ ، سورہ الروم ، آیات ۲۲

کے اسی تجربہ کا مقابلہ علمائے طبعی کے مشاہدات سے کرتے ہوئے ، جو حقیقت کے مجازی پہلو اور اسکے تغیرات کے علم پر مشتمل ہوتے ہیں ، کہتے ہیں :

محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

حیات انسانی کے نصب‌العین کا تعین اور مذہب :

ذہنی تربیت اور نشو و نما، اور اس کے ذریعہ علوم طبعی کی تحصیل ، اقبال کے نزدیک تعلیم کا یقیناً ایک اہم جز ہے ، کیونکہ علوم طبعی کی تحصیل انسانی شخصیت کے اس پہلو کی نشو و نما اور ترقی کا باعث ہوتی ہے ، جسکی نمائندگی قوت سے ہوتی ہے - لیکن قوت محض، ایک کامل شخصیت کی تشکیل نہیں کرسکتی - ایک کامل شخصیت کی تشکیل کا اصول اقبال کے نزدیک یہ ہے : قوت حق کی رہنمائی میں (Power guided by Truth) علم و حکمت جو عقل کے زائیدہ ہیں، حقیقت کے باطنی پہلو تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے - حقیقت کے عین یا نصب‌العین (Ideal) کا تجربہ ، حیات کی اعلیٰ‌تر استعداد سے متعلق ہے ، جس کی نمائندگی مذہب سے ہوتی ہے - علم و حکمت کے ذریعہ نفس الامری (Real) اور مقرون (concrete) کا علم، اور اس کی تسخیر تو ممکن ہے ، لیکن حیات انسانی کے نصب‌العین کا تعین ، علم و حکمت یا عقل کے ذریعے نہیں ، بلکہ وحی حق ، یا روح کے ذریعہ ہوسکتا ہے - حیات کی صحت و ارتقا کا انحصار اس امر پر ہے کہ نصب العین کی روشنی میں ، خارجی اور واقعی اشیا کی تنظیم و ترتیب کی جائے ، روح یا اعماق حیات سے پھوٹنے والی شعاعوں کی روشنی میں ، بالفاظ دیگر ، وحی حق کی رہبری میں ، مادہ کو حسب خاطر ڈھالا جائے - پس علوم و حکمت ایک کامل شخصیت کی تشکیل و ارتقا کے حق میں ، اسی وقت کارآمد ہوسکتے ہیں ، جبکہ وہ روح کے مقاصد کے تابع ہوں - رومی بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

علم را بر دل زنی یارے بود علم را برتن زنی مارے بود

اصل تہذیب مذہب ہے :

اقبال کے نزدیک اصل تہذیب مذہب ہے :

اصل تہذیب است دیں ، دین است عشق

مذہب انسانی جذبات و حسیات کی حقیقی تہذیب و تربیت کرتا ہے ، اور

قوائے ذہن و عمل کے اظہار کے لیے مخصوص راہوں کا تعین کرکے، انسان کے ہلاکت کی راہ پر پڑ جانے کے امکانات کو روکتا ہے - یہ تہذیب و تربیت، علم حق کی بصیرت سے فیض یاب ہونے پر مبنی ہے - اور علم حق شریعت کے سوا اور کچھ نہیں - مرضی حق سے عشق ' اور مرضی حق کی اتباع، یہی شریعت کا راز ہے، اور اسی شریعت کی پابندی اسلام کی اساس ہے :

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
با تو گویم سرِ اسلام است شرع شرع آغاز است و انجام است شرع

لیکن شریعت کی اتباع، آزاد شخصیت پر کوئی خارجی بندش نہیں، بلکہ وہ عالمگیر بصیرت کے حامل ایسے اصولوں کی اتباع ہے، جس کے بغیر انسانی شخصیت کا جوہر، مکمل نمود حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ 'وحی حق، جو مذہب کی اساس ہے ' « سود و بہبود ہمہ » (Good of all) کے اصول پر مبنی ہے :

وحی حق بینندۂ سود ہمہ در نگاہش سود و بہبود ہمہ

شرع کی پابندی فی الحقیقت انسان کی آزاد شخصیت کا اثبات ہے- وہ شخصیت کے اعلیٰ جوہر (Higher Principle) کی آزادی کا اثبات ہے- کیونکہ شرع کا راز، اقبال کے نزدیک سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ انسان کی آزاد شخصیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کو تمام خارجی قوتوں کی غلامی سے بے نیاز کردیا جائے :

کس نباشد در جہاں محتاج کس نکتۂ شرع مبیں این است وبس

اس طرح اقبال کے نقطۂ نظر سے تہذیب و تربیت کا بنیادی اصول، شخصیت کے اعلیٰ جوہر، قلب یا روح کی آزادی کا اثبات؛ اور شخصیت کے ادنیٰ جوہر، یا انسان کی مادی ہستی کو، قلب یا روح کے مقصود، خدا کی مرضی کے تابع کرنا ہے - جب شخصیت کا ادنیٰ جوہر ' اعلیٰ جوہر کے تابع ہوجاتا ہے، بالفاظ دیگر، جب انسان کی مادی ہستی کی خواہشیں، قلب یا روح کی رہنمائی کی پابند ہوجاتی ہیں، تو انسان کے جذبات و احساسات کے فاسد عناصر جل کر پاکیزہ ہوجاتے ہیں، اور خام اور ناقص انسان پختگی اور کمال حاصل کرلیتا ہے - اس طرح ادنیٰ جوہر کی آزاد فعلیت کے سبب، انسانی شخصیت کے تباہی و ہلاکت سے دوچار ہونے کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں -

قرآن انہیں مہلک امکانات سے انسان کو متنبہ کرتا ہے :

« واتبـع هـواه فـتردی » [1]

« لا تتبع الهوی فیضلک عن سبیل الله » [2]

عقل جیسا کہ وضاحت کی گئی ، شخصیت کا کوئی بنیادی جوہر نہیں ، بلکہ وہ محض ایک حربہ یا آلہ ہے ، انسان کی مادی ہستی کا - عقل ، روح کے مقصود تک رسائی میں مدد دیتی ہے - لیکن مقصود یا نصب العین کا تعین اس کے بس سے باہر ہے .

شخصیت کا ادنیٰ جوہر ، اور علم و حکمت :

اقبال طبعی علوم کو تعلیم کا ایک اہم جز ضرور تسلم کرتے ہیں ، لیکن وہ تعلیم جدید کے اس مسلک کا ابطال کرتے ہیں کہ علوم کو شخصیت کے اعلی جوہر کی گرفت سے آزاد کردیا جائے ، اور شخصیت کا ادنیٰ جوہر علوم کے مصرف کا تعین کرے - جب شخصیت کا ادنیٰ جوہر علم و حکمت کی رہنمائی کرنے لگے ، تو علم و حکمت ابلیس کا حربہ ثابت ہوتے ہیں - چنانچہ اسلامی تہذیب میں علم و حکمت کے عنصر کی حیثیت کا مقابلہ ، مغرب جدید کی تہذیب میں علم و حکمت کے عنصر کی حیثیت سے کرتے ہوئے ، اقبال علم کی آفریدہ ہلاکت سامانی کا اس طرح نقشہ کھینچتے ہیں :

هرچه می بینی ز انوار حق است — حکمت اشیا ز اسرار حق است
هرکه آیات خدا بیند حُراست — اصل ایں حکمت ز حکم انظراست
بندۂ مومن ازو بہروز تر — هم به حال دیگراں دل سوز تر
علم چوں روشن کند آب و گلش — از خدا ترسنده تر گردد دلش
علم اشیا خاک مارا کیمیاست — آه در افرنگ تاثیرش جداست
عقل و فکرش بے عیار خوب و زشت — جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت
دانش افرنگیاں تیغے بدوش — در هلاک نوع انساں سخت کوش
با خساں اندر جهان خیر و شر — درنسازد مستئی علم و هنر
آه از افرنگ و از آئین او — آه از اندیشۂ بے دین او
علم حق را ساحری آموختند — ساحری نے کافری آموختند
عقل اندر حکم دل یزدانی است — چون ز دل آزاد گشت شیطانی است

---

[1] قرآن ، سوره طه ، آیت ١٦

[2] قرآن ، سوره ص ، آیت ٢٥

تعلیم جدید جذبۂ عشق کو بیدار نہیں کرتی :

جدید مغربی تعلیم صرف ذہن انسانی کی نشو و نما اور تربیت کرتی ہے ۔ پھر عقل کی فتوحات سے جو مسرت و کامرانی حاصل ہوتی ہے یہی علوم مغرب کا حاصل ہے ۔ وہ حیات انسانی کے بنیادی جذبۂ عشق کو خفتہ و خوابیدہ چھوڑ جاتی ہے ۔ اسلئے علوم مغرب میں وہ کیف غم مفقود ہوتا ہے، جو روح کے جذبۂ عشق کی بیداری اور اسکے سوزو درد سے پیدا ہوتا ہے ۔ اقبال مغرب کی اس شراب سے تنگ آکر ان تلخ جرعوں کے طالب ہوتے ہیں، جو روح کے سکون و جمود کو ختم کردیں، اور جذبۂ حیات میں ایک شورش و ہنگامہ کی پیدائش کا باعث ہوں :

پیر مغاں فرنگ کی مٹی کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں مجھکو تو خانہ ساز دے

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز
دل کے ہنگامے مٹے مغرب نے کرڈالے خموش

ذیل کے اشعار میں بھی اقبال ایک صاحب دل انسان کے نقطۂ نظر سے، جدید مغربی علوم کی تشریح و تنقیح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ علوم جدید، حقیقت کے مجازی پہلو (Phenomena) کے گرد چکر لگاتے ہیں، اور حقیقت کے عین تک رسائی حاصل نہیں کرتے ۔ ان علوم کی تحصیل حیات کے بنیادی جذبۂ عشق کو بیدار نہیں کرتی، بلکہ اس کو خفتہ و خوابیدہ چھوڑ جاتی ہے ۔ علوم جدید خودی کی پوشیدہ توانائی کے حق میں سوز عشق کی طرح ایک اشتعال انگیز عامل (Explosive agent) کی حیثیت نہیں رکھتے، جسکی بدولت جوہر انسانی میں دھماکا پیدا ہوجائے :

سوز عشق از دانش حاضر مجوے — کیف حق از جام ایں کافر مجوے
مدتے محو تگ و دو بودہ ام — رازدان دانش نو بودہ ام
دانش حاضر حجاب اکبر است — بت فروش و بت پرست و بت گراست
پا بہ زندان مظاہر بستۂ — از حدود حس برون ناجستۂ
آتشے دارد مثال لالہ سرد — شعلۂ دارد مثال ژالہ سرد
فطرتش از سوز عشق آزاد ماند — در جہانؔ جستجو ناشاد ماند

عشق افلاطون علت هاے عقل به شود از نشترش سوداے عقل
جمله عالم ساجد و مسجود عشق سومنات عقل را محمود عشق
این مئے دیرینه در میناش نیست سوز یارب قسمت شبهاش نیست

تعلیم صحیح اور ولولۂ حیات کی بیداری :

اقبال کے نقطۂ نظر سے جدید تعلیم ادھوری ، نامکمل ، اور بےجان تعلیم ھے ، جو شخصیت کے صرف ایک ذیلی جز کی تربیت اور نشو و نما کو اپنا مقصد قرار دیتی ھے - اقبال کے نزدیک تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ھے کہ وہ انسان کے بنیادی ولولۂ حیات میں سورش و ہنگامہ پیدا کردے - جذبۂ حیات کی بیداری انسان کی کامل شخصیت کی بیداری ھے ، جو شخصیت کی ہرجہتی توسیع و نشوونما کی شکل میں ظاہر ہوتی ھے - « ارمغان حجاز » میں اقبال نے تعلیم کے عنوان سے جو قطعات کہے ھیں ، اس میں تعلیم کے اسی نصب العین کی صراحت کرتے ھیں :

تب و تابے که باشد جاودانه سمند زندگی را تازیانه
به فرزنداں بیاموز ایں تب و تاب کتاب و مکتب افسون و فسانه

جوھر انسانی کے دھماکے کے لئے ایک بڑا دماغ لازمی شرط نہیں ھے - ایک تڑپتا ہوا دل اس کی بنیادی شرط ھے اور دل کی خلش و اضطراب کے درجے پر انسانی شخصیت کی عظمت کا انحصار ھے - اقبال کے نزدیک حیات کے بنیادی ولولہ میں شورش و اضطراب کا پیدا ہونا ، انسانی زندگی کا سب سے زیادہ بیش بہا سرمایہ ھے :

در جهاں جز درد دل ساماں مخواه

زندگی بر آرزو دارد اساس خویش را از آرزوے خود شناس

قسمت هر دل به قدر هاے وهوست

عظمت انسانی کی شرط :

حیات کے بنیادی ولولہ میں ایک زبردست شورش و ہنگامہ کی پیدائش ھی ، عظیم الشان شخصیتوں کے ظہور کا باعث ہوتی ھے - اور یہ انسانی عظمت ایک بڑے دماغ کے واسطے سے ظاہر ہوسکتی ھے ، اور اس کے بغیر بھی - تعلیم جدید کے اس رجحان

پر تنقید کرتے ہوئے جو دماغی تربیت اور نشوونما کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے ، اقبال اربات تعلیم کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ نوجوانوں کی سیرت سازی کے عظیم الشان کام میں، دماغ کو نہیں ، بلکہ جو ہر حیات کو ٹٹولیں ، اور اس کو اپنی توجہ کا بنیادی معروض قرار دیں :

ترا نومیدی از طفلاں روا نیست چہ پروا گر دماغ شاں رسا نیست
بگو اے شیخ مکتب گر بدانی کہ دل در سینۂ شاں ہست یا نیست

جدید تعلیم، اور روباھی سیرت :

شخصیت انسانی کے ایک جز کی تربیت اور نشوونما ، اور دوسرے اھم تر جز کو نظر انداز کرکے ، جدید تعلیم شخصیت کے صرف ایک پہلو کو بیدار ، اور دوسرے کو خوابیدہ ھی نہیں چھوڑتی ؛ بلکہ تعلیم کا یہ ادھورا اور ناقص نظام ، انسانی شخصیت میں فساد طبع کی پیدائش کا باعث ھوتا ھے ۔ جدید تعلیم کا موضوع ذھن انسانی کی نشوونما ھے ، نہ کہ انسانی عزم (will) یا بنیادی جذبۂ حیات کی ۔ اس لیے بنیادی ولولۂ حیات کا نظر انداز کردیا جانا ، اور ذھن انسانی کی نشوونما ، عزم حیات کی بے انتباھی اور عقل کی تیزی ان سب کا امتزاج ، ایک کمزور لیکن چالاک انسان کی تخلیق کا باعث ھوتا ھے۔ اقبال کے الفاظ میں جدید مغربی تعلیم روباھی سیرت کی تخلیق کرتی ھے ۔ ان اشعار میں اقبال مغربی تعلیم کے اسی اثر کو واضح کرتے ھیں :

روبھی آموختم از خویش دور افتادہ ام چارہ پردازاں بہ آغوش نیستانم برید

وہ آنکھ کہ ھے سرمۂ افرنگ سے روشن پُر کار و سخن ساز ھے نم ناک نہیں ھے

علوم جدید مظاھر کے گرد گھومتے ھیں :

اشیاء کے مجازی پہلو کے علم ، یا علوم طبعی کی تحصیل کی بدولت ، انسان غیر خود کے متعلق تو کچھ آگاھی حاصل کرلیتا ھے ، لیکن خود اپنی ذات کے سرچشمۂ لذت و حیات سے بے خبر رھتا ھے ۔ ماھرین فلکیات کے سحابوں (hyperbolas) کے راستوں کے متعلق تحقیق و تفتیش ، ماھرین طبعیات کی جوھر کے اندرونی برقیوں کی ساخت سے متعلق تحقیقات ، ماھرین نباتیات کے حقیر ترین نباتی جرثوموں پر تجربات ، علماء اور محققین کی یہ ساری مساعی ، تمدن کے ارتقا میں نہایت قیمتی سہی ، لیکن یہ سب غیر خود کے

گرد گھومتی ھیں۔ خود انسانی شخصیت کے مرکزے (nucleus) سے جو بجاے خود ایک کائنات اور اعلیٰ ترین تخلیقی قوت کا سرچشمہ ھے، نہ ماھر فلکیات آگاہ ھے نہ ماھر نباتیات و نفسیات ۔ انسانی عقل کی اس تمام تگ و دو کی مثال، ایک اندھے کی ھے جو فضا میں ٹٹولتا ھوا، جدھر مزاحمت محسوس نہ ھو، اور راستہ کھلا نظر آئے، آگے بڑھتا چلا جاتا ھے؛ نہ منزل مقصود اسے دکھائی دیتی ھے، اور نہ وہ راستہ جو منزل تک لے جاتا ھے۔ یا پھر اس کی حالت ایک لکۂ ابر کی سی ھے کہ جسے ھوا کے جھونکے فضا میں اوپر نیچے جس سمت میں چاھتے ھیں اڑا لے جاتے ھیں۔

ازاں فکر فلک پیماچہ حاصل — کہ گـــرد ثابت وسیار گردد
مثال پارۂ ابرے کہ از باد — بہ پہناے فضا آوارہ گردد

محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے — بیناے کواکب ھو کہ داناے نباتات

عرفان ذات کے اساسی علم کی کمی:

«ضرب کلیم» کے تعلیم و تربیت کے حصے میں «مہمان عزیز» کے عنوان سے، اقبال تعلیم جدید میں خودی یا ذات کے علم کی اسی کمی کی طرف اشارہ کرتے ھیں:

پُر ھے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اُس دور میں ھے کس کو تمیز
چاھئے خانـــۂ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمان عزیز

ان اشعار میں بھی اقبال، جدید نظام تعلیم میں علم خودی کے سوا، جو شخصیت کی تشکیل و توسیع کے لیے اساسی نوعیت کا علم ھے، دیگر ساری خرافات کی موجودگی پر اس طرح طنز کرتے ھیں:

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقامات
بہتر ھے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رھیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور — محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات
محکوم کے حق میں ھے یہی تربیت اچھی — موسیقی و صورت‌گری و علم نباتات

جدید تعلیم میں عرفان ذات کے اساسی علم کی کمی، اور غیر خود کے طواف میں انہماک کے سبب، جوہرخودی کی تباہی کی طرف ان اشعار میں بھی اشارہ کیا ہے:

نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے نگاہ وہ ہے جو محتاج مہر و ماہ نہیں
کھلے ہیں سب کے لئے غربیوں کے مے خانے علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی تیری ترے بدن میں اگر سوز لاالہ[1] نہیں

«ضرب کلیم» میں «آگاہی» کے عنوان سے بھی علوم جدیدہ میں عرفان ذات کے اساسی علم کی کمی کو واضح کیا ہے:

نظر سپہر پہ رکھتا ہے جو ستارہ شناس نہیں ہے اپنی خودی کے مقام سے آگاہ
خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا وہی ہے مملکت صبح و شام سے آگاہ
وہی نگاہ کے ناخوب و خوب سے محرم وہی ہے دل کے حلال و حرام سے آگاہ

خود آگاہی، علم کی اساس ہے:

اقبال کا نصب العینی انسان، جو علو ذات کے اعلیٰ ترین نصب العین «خدا» کو اپنا منتہا قرار دیتا ہے، خود آگاہی اور خود طوافی کو علم کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ خدا کا منکر کافر ہے، لیکن خودی کا منکر اور خودی کو نظر انداز کرنے والا انسان، اقبال کے نزدیک بدتر قسم کے کافر کی حیثیت رکھتا ہے:

منکر حق نزد ملا کافر است منکرخود نزد من کافر تراست

اقبال عہد حاضر کے تعلیمی نظام سے اسی لئے نفرت کرتے ہیں کہ وہ ایک دل بیدار رکھنے والی شخصیت کی تخلیق نہیں کرسکتا اور جوہر حیات کو نظر انداز کرکے مظاہر کی پرستش میں منہمک ہے:

بہ آں مومن خدا کارے نہ دارد کہ در تن جانِ بیدارے ندارد
ازاں از مکتب یاراں گریزم جوانے خود نگہ دارے ندارد

عین ذات کی ایک جھلک بھی انسان کے بنیادی ولولۂ حیات میں ایک عظیم شورش و ہنگامہ پیدا کردیتی ہے اور اس کو زبردست قوت تخلیق سے معمور کردیتی ہے؛ اسی منزل پر پہنچ کر انسان پر یہ دائمی راز بھی منکشف ہوتا ہے کہ ذات ہی کائنات

(۱) لاالہ غیر خود کی نفی اور ارتقائے ذات کے اعلیٰ ترین نصب العین «کبریا» کا اثبات کرنےوالا اصول ہے۔

کی حقیقت ہے ، اس کے سوا باقی سب کچھ مجاز اور خودی کی فعلیت کے لئے ایک بازیچہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔

تعلیم جدید جوہر حیات کی نفی کرتی ہے :

جدید تعلیم کی روح ، جو خودی کے حیات انگیز علم کو نظر انداز کرنے اور غیر خود کے طواف پر مبنی ہے ، شخصیت کے جوہر کو کچلنے اور ولولۂ حیات کو فنا کرنے کا باعث ہوتی ہے ۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کا یہ نظام شخصیت کے حق میں ایک تیزاب کی حیثیت رکھتا ہے ، جو خودی کو جلا کر انسانی جوہر کو فنا کردیتا ہے ۔ تعلیم جدید کے ہاتھوں ہونہار اور ابھرتی ہوئی خودیوں کی تباہی کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ، اقبال کہتے ہیں :

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے　　نگاہ او چوں شیراں بے پناہے
بہ مکتب علم میشی رام کردند　　میسر نایدش برگ گیاہے

« ضرب کلیم » میں ایک « لرد فرنگی » اپنے فرزند کو نصیحت کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ پسماندہ قوموں کے افراد کی تسخیر کے لیے تعلیم جدید سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ، جس کی مدد سے غیور اور ناقابل تسخیر خودیاں بھی جل کر بھسم ہوجاتی ہیں ۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو　　ہوجائے جو یہ نرم جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب　　سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے ایک ڈھیر

جدید مغربی تعلیم کے خودی سے بیگانہ بنانے کے مضمون کو ایک اور مقام پر اس طرح ادا کیا ہے :

بیا اقبال جامی از خمستان خودی درکش　　تو از می‌خانۂ مغرب زخود بے گانہ می آئی

اسلامی تہذیب ، اور تعلیم کا تصور :

مغربی تعلیم کے برعکس ، اسلامی تہذیب تعلیم کے جس تصور کی حامل ہے ، اس کا مقصود محض ذہن انسانی کی تربیت اور نشوونما نہیں ، بلکہ انسان کے بنیادی ولولۂ حیات کو مشتعل کردینا ہے ۔ بالفاظ دیگر اسلام کا تصور تعلیم دل کی بیداری ، یا جذبۂ عشق کی آگ کے تیز کرنے کو اپنا بنیادی مقصود قرار دیتا ہے ، وہ ایک مخصوص تہذیب کو انسان کے خون میں سرایت کردینے کے اصول پر مبنی ہے جس کی بدولت شخصیت کے تمام

قوائے ذہن و عمل ایک نصب العین پر مرکوز ہوجاتے ہیں، اور خودی کی منتشر قوتوں کے ایک نقطہ پر مرتکز ہوجانے سے، ان میں ایک دھماکا پیدا ہوجاتا ہے۔

تعلیم کی حرکی قدر:

تعلیم کا یہی حرکی (Dynamic) تصور تھا، جس کی بدولت ابتدائے اسلام میں ایک صحرائی قوم نے جو ماضی میں اپنا کوئی تمدن تک نہ رکھتی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے، ساری دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کردیا، اور بیس بائیس سال کی قلیل مدت میں، ایران و روما کی طاقتور اور مستحکم مملکتوں کو مغلوب اور ان کی قدیم اور دیرینہ تہذیب و تمدن کو ماند کردیا؛ اسطرح دنیا کے ایک بڑے حصے کی قلب ماہیت کردی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کی یہ مخصوص تہذیب جب شخصیت میں سرایت کرگئی، تو ادنیٰ اور متوسط طبقے کے افراد نے بھی عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ ایران اور روما کے درباروں کی عظمت و سطوت بھی ان کی نگاہوں میں نہ جچتی تھی، اور بے سرو سامان معمولی سپاہی بھی ایران کے حاکموں کے پرشکوہ دربار میں اس شان سے داخل ہوتے تھے، کہ اپنے نیزے کی انی فرش کی قیمتی قالینوں میں دھنساتے، دراتے چلے آتے ہیں، تن پر نہ پُر تکلف لباس ہے، نہ قیمتی زرہ بکتر، لیکن ان کی آنکھوں سے آگ برستی ہے، اور ان کی پُر جلال شخصیت دیکھنے والوں پر ہیبت طاری کردیتی ہے[1]

یہ انسان کے بنیادی جذبۂ حیات کو برقا دینے والی تعلیم کے زائیدہ انسان کا نمونہ ہے۔ پھر اسی تعلیم کی روح کی پیداوار وہ عالی مرتبت دماغ ہیں، جو علوم کی مختلف شاخوں میں ایک زمانے تک اپنے علم و فن کی سند سمجھے جاتے تھے۔ انہوں ہی نے یورپ میں علم و حکمت کی شمع کو از سرنو روشن کیا، اور علوم طبعی کی داغ بیل ڈالی[2]۔

اقبال انسان کے بنیادی ولولۂ حیات، یا دل کو بیدار کرنے، اور خام انسان کو انسان کامل میں تبدیل کردینے والی، اسی تعلیم کی روح کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

دل بیدار فاروقی، دل بیدار کراری
مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

---

۱ شبلی نے اسلامی سفرا کی یزدگرد اور رستم سے ملاقات کے بیان میں یہ نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے ملاحظہ ہو، الفاروق، حصہ اول، ص ٦٧ تا ٦٩

۲ دی کنٹرکشن، ص ۱۲۳

دل بیدار پیداکر که دل خوابیده هے جبتک
نه تیری ضرب هے کاری نه میری ضرب هے کاری

لیکن تعلیم کا موجودہ نظام ، جو حقیقت کے مرکزہ کو نظر انداز کرکے ، صرف قشر کو اپنا موضوع بنائے ہوئے هے ، دل بیدار کی حامل عظیم شخصتیں پیدا کرنے سے قاصر هے ۔ جدید تعلیم ولولۂ حیات کے ابتدائی شعله کو بھڑکاکر آتش همه سوز میں تبدیل نہیں کرتی ۔ وہ جذبۂ حیات میں وہ شورش و هنگامه پیدا نہیں کرسکتی ، جو جوهر انسانی کو مشتعل کردے ۔ اس کے برعکس شخصیت کے جوهر یا قلب کو نظرانداز کرنے کے سبب، یه تعلیم خودی کی نشو و نما میں ایک منفی قوت ثابت هوتی هے اور دل کو بیدار کرنے کی بجاے ، اس شعله کو فسرده اور سرد کردینے کا باعث هوتی هے ۔ ذیل کے اشعار میں اقبال اسی حقیقت کو واضح کرتے هیں :

پھر یه غوغا هے که لا ساقی شراب خانه ساز
دل کے هنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

چه کنم چه چاره گیرم که ز شاخ علم و دانش
نه دمیده هیچ خارے که به دل نشاندم اورا

مکدر کرد مغرب چشمه هاے علم و عرفان را
جهاں را تیره‌تر سازد چه مشائی چه اشراقی

حکمت و فلسفه کرد است گراں خیز مرا
خضرمن از سرم ایں بار گراں پاک انداز

نٹشے کا زاویه نظر:

خودی اور عزم اقتدار کا مفسر ، نٹشے بھی اقبال کی طرح ایسی تعلیم اور ایسے علم و حکمت کو شخصیت انسانی کے حق میں زهر هلاهل قرار دیتا هے ، جو شعلۂ حیات کو مدهم ، روح کو گراں خیز اور جوش حیات کو اُکسانے اور برقانے کی بجاے اس کو فسرده اور سرد کرنے کا باعث هوں ۔ ذیل کے اشعار میں وہ انسان کے بنیادی

ولولۂ حیات کو نظرانداز کرنے والی ناقص تعلیم، اور محض مظاہر کے گرد گھومنے والے علم و حکمت کا ابطال کرتا ہے، جس کی وجہ سے مریض طبع (decadent) انسان یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے، کہ معرفت اور علم و حکمت حیات کو گراں خیز بنا دیتے، اور جوش حیات کو فسردہ کر دیتے ہیں۔ نٹشے کے نزدیک بھی حیات کے بنیادی عزم و ولولہ کو نظر انداز کر کے، ذرائع یا راستوں میں گم ہوجانا طبع انسانی کے زوال کی علامت ہے:

« جو شخص بہت سیکھتا ہے وہ تمام جوشیلے جذبات کو بھول جاتا ہے۔ یہ کانا پھوسی لوگ اندھیری گلیوں میں آج کل کرتے ہیں۔

« دانشمندی سست بنادیتی ہے، اس سے کوئی فائدہ نہیں، اس جدول کو میں نے عام طور پر بازاروں میں لٹکتا دیکھا ہے۔

« توڑ ڈالو میرے بھائیو توڑ ڈالو، اس نئی جدول کو بھی۔ دنیا سے اکتا جانے والوں نے اس کو آویزاں کیا ہے، واعظین موت اور محبس کے محافظین نے۔ دیکھو یہ بھی غلامی کا وعظ ہے۔

« ان کا معدہ اس وجہ سے خراب ہوگیا ہے کہ ان کی تعلیم خراب ہوئی ہے، اور بہترین چیز کی تعلیم بالکل نہیں ہوئی۔ ساری تعلیم بہت پہلے اور بہت تیز ہوئی، اس وجہ سے کہ ان کے کھانے کا طریقہ برا ہے۔

« ان کی روح ایک بگڑا ہوا معدہ ہے[1]۔ وہ موت کا مشورہ دیتا ہے؛ اور میرے بھائیو روح واقعی ایک معدہ ہے۔

« زندگی مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔ لیکن جس کے اندر بگڑا ہوا معدہ بولتا ہو، جو ساری تکالیف کی بنیاد ہے، اس کے سارے چشمے زہر آلود ہوجاتے ہیں۔

« معرفت حاصل کرنا، یہ « شیر عزم » (Lion.willed) انسان کے لیے مسرت روحانی ہے۔ لیکن جو تھکا ماندہ ہوتا ہے، وہ دوسروں کے عزم کا معروض ہوتا ہے۔ تمام موجیں اس کے ساتھ کھیلتی ہیں۔

---

۱ بگڑے ہوئے معدے سے « قلب مریض » مراد ہے، جو « قلب سلیم » کی ضد ہے۔

«اور کم زور آدمیوں کی ہمیشہ یہ فطرت رہی ہے کہ وہ اپنے راستوں میں کھو جاتے ہیں ۔ بالآخر ان کی تکان اُن سے یہ سوال کرتی ہے آخر ہم راستہ چلیں ہی کیوں ؛ سب چیزیں غیراہم ہیں ۔
«عزم آزاد کنندہ ہے کیونکہ عزم مرادف ہے خلق کرنے کا ۔ یہ میری تعلیم ہے اور تمھارے سیکھنے کا مقصد محض تخلیق ہونا چاہئیے ۔
«اور سیکھنے کا فن بھی پہلے تمھیں مجھ سے سیکھنا چاہئے ، بہترین چیز سیکھنے کا فن ۔ جس کے کان ہوں وہ سنے[1] » ۔

تعلیم اور ولولۂ حیات کی تازگی :

نٹشے کے نزدیک بھی علم و حکمت اور دانشمندی و معرفت کا منشا یہ ہونا چاہیے کہ وہ انسان کے بنیادی ولولۂ حیات کو تحریک دیں ، اس میں تازگی اور خروش پیدا کریں ، اور انسان کو حیات کا باطنی کیف و سرور بخشیں ، ادراک ذات کی اس لذت و انبساط سے آگاہ کریں ، جو تمام اعلیٰ تخلیق کا سرچشمہ ہے ۔ وہ علم و حکمت جو لذت حیات کے حقیقی مقصد کو نظر انداز کردے ، باطل محض ہے :

«گم ہو[2] ہمارے لیے وہ دن جبکہ ہم ایک بار بھی رقص نہ کریں ، اور جھوٹ سے تعبیر کی جائے ہر وہ سچائی جس کے ساتھ ہنسی نہ پائی جائے ۔ »[3]

حقیقی عظمت ، فطرت اصلی کی تازگی کو برقرار رکھنے میں مضمر ہے :

انسان کی حقیقی عظمت اور اسلامی تہذیب کی عظمت و صداقت کا راز بھی اسی میں مضمر ہے کہ انسان کی فطرت اصلی کی تازگی کو برقرار رکھا جائے ، اور اس کی تربیت اور نشو و نما کی جائے ۔ تمدنی زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں ، اور معاشرتی ، اخلاقی اور مذہبی قدروں نے ، جو عرصۂ دراز سے انسان پر اثر انداز ہورہی ہیں ، اس کی فطرت اصلی کو طرح طرح سے ملوث اور مسخ کردیا ہے ۔ ناقص اور غیر صالح تعلیم

۱ نٹشے ، بقول زرتشت ، ص ۲۹۲ ، ۲۹۳

۲ نٹشے حالت صحت میں شخصیت یا ذات کے اسی بنیادی وصف ، سرورذات (Self-enjoyment) کی طرف اشارہ کرتا ہے ، جب وہ کہتا ہے « میں صرف ایسے خدا پر ایمان لاسکتا ہوں ، جسے ناچنا آتا ہو » (بقول زرتشت ، ص ۵۵)

۳ نٹشے ، بقول زرتشت ، ص ۲۹۹

کا ایک مضر اور مہلک پہلو یہ ہے کہ وہ فطرت انسانی کے ملوث اور مسخ شدہ میلانات اور رجحانات کو نشو و نما دیتی ہے - اور اس طرح انسان کو اس کی اصلی فطرت سے دور لے جاتی ہے - (مثلاً نفی حیات کی تلقین کرنے والے مذاہب کی اخلاقی خوبیاں، جو ہنوز معاشرتی نیکیاں تصور کی جاتی ہیں) اس طرح تعلیم پر فساد طبائع کی مسلسل پیداوار کے آلہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے -

سیرت میں نسوانیت پیدا کرنے والی قوتیں :

معاشرتی اور تمدنی زندگی، جیسے جیسے پیچیدہ ہوتی جاتی ہے، اس میں ایسی قومیں بے روک طریقہ پر اثر انداز ہوتی ہیں، جو شخصیت میں غیر صالح اور غیر مستحکم تہذیب کے نفوذ کا باعث ہوتی ہیں، اور جن میں انسانی سیرت میں نسوانیت پیدا کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے - چنانچہ قوموں کی زندگی میں جب تکان پیدا ہوتی ہے، تو ولولۂ حیات کے حق میں خواب آور عناصر، انہیں حسین و لطیف معلوم ہونے لگتے ہیں، اور قوم کے قوائے ذہنی خواب آور فلسفہ، آرٹ اور تصوف کی جانب مائل ہوجاتے ہیں - اس لیے تمدنی زندگی کی پیچیدگیوں میں، انسان کی فطرت اصلی کی دریافت، بجائے خود ایک مسئلہ ہے - یہی سبب ہے کہ بشریت کے قوی اور صحت مند تصور کا عظیم معلم (Educator)، جو انسانی قویٰ کو بھٹکی ہوئی راہوں سے ہٹاکر، پھر بشریت کے ارتقا کی عظیم الشان شاہراہ پر ڈال دیتا ہے، معاشرتی زندگی سے ہٹ کر حیات کا تجربہ کرتا ہے - وہ پہاڑوں، جنگلوں اور غاروں کی تنہائی میں، معاشرتی زندگی کے اثرات سے آزاد ہوکر، فطرت انسانی کے اصلی اور بنیادی عناصر کو دوبارہ دریافت کرتا، اور تعلیم و تربیت کے حقیقی معروض (object-) کا تعین کرتا ہے - اقبال ان اشعار میں ایک معلم آعظم، یا ایک مرد کامل کے نقطۂ نظر سے، تعلیم کے اسی انتہائی اساسی اصول کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی — یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی
دنیا میں محاسب ہے تہذیب فسوں گر کا — ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی
یہ حسن و لطافت کیوں وہ قوت و شوکت کیوں — بلبل چمنستانی، شہباز بیابانی
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن — نبتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی[1]

ذیل کے اشعار میں بھی اقبال جوہر خودی کے دھماکے کو، انسان کی فطرت اصلی کی نگہداشت اور تربیت کا تابع قرار دیتے ہیں، اور حقیقی بشریت کی تربیت کے لیے وہ فطرت کے ازلی مکتب کا سراغ دیتے ہیں۔ «خودی کی تربیت» کے عنوان سے لکھتے ہیں:

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز
یہی ہے سر کلیمی ہر ایک زمانے میں ہوائے دشت و شعیب و شبانی شب و روز

انسان کی فطرت اصلی یا انسان کے اصلی اور حقیقی جوہر کا دھماکا ہی مرد کامل کی شخصیت پیدا کرسکتا ہے۔ ایک مریض اور فاسد خودی کے دھماکے سے، نٹشے کے الفاظ میں «خاتون اعظم» یا اسی قبیل کے دوسرے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں جس چیز کو اقبال نے «مشام تیز» سے تعبیر کیا ہے، وہ صحت مند اور توانا طبائع کا ذوق صحیح ہے جسے رومی نے «قلب سلیم[2]» یا ذوق صحیح کہتے ہیں۔ اسی ذوق صحیح کی اساسی اہمیت پرزور دیتے ہوئے، نٹشے بڑی شدت سے اپنے اس خیال کا اعادہ کرتا ہے۔

"My genius resides in my nostrils"

فاسد طبائع، جو «قلب مریض» کی حامل ہوتی ہیں، ذوق صحیح (جو اشیا کو قطعی طور پر «ہاں» یا «نہیں» کہہ کر مستحسن یا مردود قرار دیتا ہے) کی عدم موجودگی میں، ظن و تخمین کے ذریعہ جوہر حیات کو حاصل کرنے کی جستجو کرتی ہیں۔ لیکن قلب مریض کو جوہر حیات نہیں، بکلہ کوئی نہ کوئی مرض ہی ہاتھ لگتا ہے۔ اقبال مرد کامل کی پیدائش کے اسی اصول کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

دل بیدار فاروقی، دل بیدار کراری مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری
مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

---

۱ «صہبائے مسلمانی» سے مراد دین فطرت یا بصیرت الٰہی ہے۔

۲ چوں شود از رنج و علت دل سلیم طعم صدق و کذب را باشد علیم (رومی)

ہوائے بیاباں قوی سیرت کی تعمیر میں معاون ہے:

ذیل کے اشعار میں بھی اقبال نے انسان کی فطرت اصلی کی تربیت اور نشوونما میں، کوہ و صحرا کی خلوت اور ہوائے بیابان کے تازگی بخش عنصر کی اہمیت کی طرف اشارے کیے ہیں۔

وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردک میدانی
کوہسار کی خلوت ہے تعلیم خود آگاہی

ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی
وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں

اے باد بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

«بال جبریل» کی ایک نظم میں «شاہین» کے عنوان سے، جو اقبال کے نزدیک اسلام کی مخصوص تہذیب کا تمثل (Symbol) ہے شاہین کی افتادہ طبع کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے، جو ایک صحت مند اور بلند طبع خودی کے فطری میلانات کو ظاہر کرتا ہے:

ہوائے بیاباں خوش آتی ہے مجھ کو
ہے فطرت ازل سے مری راہبانہ

نہ باد بہاری نہ گلچیں نہ بلبل
نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربت غازیانہ[1]

---

[1] پروفیسر خواجہ عبدالحمید نے اپنے ایک مضمون «اقبال کے علمی جواہر ریزے» میں اقبال کی مسولینی سے ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے، اقبال کے ایک خیال کو قلمبند کیا ہے، جو اقبال نے مسولینی کے آگے ظاہر کیا تھا، اور جسے پروفیسر موصوف کو خود اقبال کی زبانی سننے کا اتفاق ہوا۔ ذیل کا اقتباس زیر بحث موضوع سے متعلق دلچسپ نکات کا حامل ہے۔

«دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات روما میں مسولینی سے ہوئی دوران گفتگو میں قوم اور مذہب کا بھی ذکر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ: «اطالیہ کی موجودہ حالت (اور اس کی حل طلب مشکل) بہت حد تک ایسی ہے جیسے کہ قبل از اسلام ایران کی تھی۔ ایران کی تہذیب فرسودہ تھی اور قوم کے قویٰ شل ہوچکے تھے، ان کو تازہ خون کی ضرورت تھی۔ ایران کی خوش قسمتی سے اس کے جوار میں عرب کی جری اور بادیہ پیما قوم تھی، جس نے ایران کو اپنا تازہ اور خالص خون دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران میں حیات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اور یہ قوم ایک پرشکوہ تہذیب کی حامل اور علم بردار ہوئی۔ عربی خون کی بدولت ان میں بہترین اہل فن، اہل سیاست، اور اہل سیف پیدا ہوئے۔ اسی طرح روما کے زوال کے بعد، گاتھ اور جرمن قوموں نے اطالیہ کو اپنا خون دیا اور اسے قرون وسطیٰ میں نشاۃ الثانیہ نصیب ہوا اب پھر ایران اور اطالیہ دونوں کو تازہ خون کی ضرورت ہے۔ ایران اب بھی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اس کے شمال میں جری اور نیم مہذب ترکمان موجود ہیں، اور مغرب میں اندرون عرب کے جری قبائل۔ یہ قومیں اپنا خون دے کر ایرانیوں کو پھر زندہ اور قوی کردیں گی۔ لیکن موجودہ اطالیہ کے گرد اسی کے جیسی مہذب قومیں آباد ہیں، جن میں صحرائی وحشت و تازگی نام کو موجود نہیں۔ اطالیہ تازہ خون کہاں سے لے گی»۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ مسولینی اس اچھوتے خیال سے بہت متاثر ہوا»۔
(آثار اقبال، پروفیسر خواجہ عبدالحمید، (اقبال کے جواہر ریزے)، ص ۷۴، ۷۵)

تعلیم جدید اور مسلمان کی سیرت :

اقبال کے نزدیک تعلیم کا بنیادی مقصود جذبۂ حیات یا ولولۂ حیات کی نگہداشت اور تربیت، اور اس شعلہ کو بھڑکاکر آتش همه‌گیر میں تبدیل کردینا ہے، نہ کہ محض ذہن انسانی کی تربیت اور نشو و نما ۔ عہد حاضر کے مروجہ نظام‌ہائے تعلیم، جن میں زندگی کے دوسرے اداروں کی طرح مغرب کی مخصوص روح کارفرما ہے، حیات کے بنیادی ولولہ یا قلب کو اپنا معروض قرار نہیں دیتے، بلکہ محض ذہن انسانی، یا وسیع‌تر مفہوم میں انسان کی مادی ہستی کو، جو بنیادی جذبۂ حیات کا صرف ایک مظہر ہے، اور شخصیت کا ادنیٰ جوہر ۔ جدید تعلیم ذہین اور چالاک، لیکن سوز حیات سے عاری انسان کی تخلیق کرتی ہے، جو روح کے خلش و اضطراب اور اسکے عزم تسخیر سے نا آشنا ہوتا ہے، اور زندگی کو محض انسان کی مادی ہستی کے سودوزیاں کے پیمانے سے ناپتا ہے ۔ ایک مسلمان کی سیرت ہے، جسکی اساس دماغ نہیں، بلکہ دل ہے، تعلیم جدید روح فرسا اثر کرتی ہے، اور اسکی طبیعت میں انحطاط و زوال پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے ۔ اس شعر میں اقبال اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

اپنی ایک نظم «مسلمان اور تعلیم جدید» میں اقبال اسی خیال کی قدرے تفصیل سے وضاحت کرتے ہیں، کہ طبعی اور صنعتی علوم وغیرہ کی تعلیم و تحصیل، ضمیر اسلام میں ایک اعلیٰ‌تر مقصد کے حصول کا محض ایک ذریعہ ہے ۔ لیکن عصر حاضر میں، حقیقی اسلامی بصیرت سے محرومی کے سبب، اس ذریعہ کو بجائے خود مقصد سمجھ لیا گیا ہے، اور اس طرح اسلام کا اثبات کرنےوالا انسان اپنی منزل سے دور تر، بلکہ غافل ہوگیا ہے :

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلم شوریدہ سر
لازم ہے رہرو کے لئے دنیا میں سامان سفر
بدلی زمانے کی ہوا ایسا تغیر آگیا
تھے جو گراں قیمت کبھی اب ہیں متاع کس مخر
وہ شعلۂ روشن ترا ظلمت گریزاں جس سے تھی
گھٹ کر ہوا مثل شرر تارے سے بھی کم نور تر

شیدائی غائب نہ رہ دیوانۂ موجود ہو
غالب ہے اب اقوام پر معبود حاضر کا اثر
ممکن نہیں اس دور میں کوشش ہو بارآور تری
فرسودہ ہے پھندا ترا زیرک ہے مرغ تیز پر
اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا
ہے خون فاسد کے لئے تعلیم مثل نیشتر
رہبر کی ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمان خضر
لیکن نگاہ نکتہ‌بیں دیکھے زبون بختی مری
« رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد »

عصر حاضر میں، اسلامی معاشرہ میں، جدید مغربی تعلیم کی ترویج کی ضرورت نے اسلامی سیرت کی حقیقی تہذیب کو، جو محض عقل پر نہیں بلکہ حیات کے بنیادی جذبۂ عشق پر مبنی ہے، کس طرح کچلا اور بےجان کردیا ہے، اسکی صراحت «ضرب کلیم» میں « مدرسہ » کے عنوان کے تحت کرتے ہوئے، اقبال اس تہذیب کی روح کو، دوبارہ دریافت کرنے کے طریقہ کا سراغ دیتے ہیں:

عصر حاضر ملک‌الموت ہے تیرا جس نے — قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا — زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش
اس جنون سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا — جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا — جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش
مدرسہ نے تری آنکھوں سے چھپایا جس کو — خلوت کوہ بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

خلاصہ:

حاصل یہ کہ تعلیم و تربیت کا مقصود اقبال کے نزدیک حیات کے بنیادی عزم یا دل کی نگہداشت اور اس کی تربیت اور نشو و نما ہونا چاہئے۔ اس کے برعکس عصر حاضر کا مروجہ تعلیمی نظام، جو ایک ناقص نظام ہے ذہن انسانی یا وسیع تر مفہوم میں نسان کی مادی ہستی کو اپنا معروض قرار دیتا ہے۔ عقل کی تربیت و نشو و نما، اور

شخصیت کے اعلیٰ جوہر یا قلب کو نظر انداز کرنے والی تعلیم، انسان کی فطرت اصلی میں فساد پیدا کرتی ہے، وہ ایک چالاک لیکن کمزور سیرت کی تشکیل کرتی ہے۔ تمدنی زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں نے انسان کی فطرت اصلی کو طرح طرح سے ملوث اور مسخ کردیا ہے، اور اس کی دوبارہ دریافت بجائے خود ایک مسئلہ ہے، جس کو صرف ایک مرد کامل کی شخصیت حل کرسکتی ہے۔ مرد کامل یا معلم اعظم، وجدان صحیح اور تیز نظر کی بدولت، انسان کی حقیقی فطرت کو، تمدنی زندگی کے ملوث کن اثرات سے علیحدہ کرکے دیکھتا ہے اور ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تخلیق کے لیے، تعلیم و تربیت کے حقیقی معروض کا تعین کرتا ہے۔ ایک معلم اعظم کی حیثیت سے، مرد کامل تعلیمی نظام کی روح رواں ہوتا ہے۔ کسی متمدن ملک کی جامعات، اساتذہ، کتب خانے، معمل اور اس کے نظام تعلیم کے دیگر تمام شعبے، اس زبردست تعلیمی قوت (Educative force) کے مقابلے میں، صرف پاسنگ ثابت ہوتے ہیں، جو جماعت میں ایک مرد کامل کے وجود سے ظہور میں آتی ہے، اور قوموں کی قلب ماہیت کردیتی ہے۔ تعلیم کے ناقص نظام، جو عالی یا فاسد طبائع کی ظن و تخمین کی پیداوار ہوتے ہیں، حیات کے جوہر کو نظر انداز کرکے، اس کے قشر کے مختلف پہلوؤں کے گرد گھومتے اور خود ناشناس، کمزور اور مریض طبع انسان کی تخلیق کرتے ہیں۔ اس طرح ناقص اور غلط تعلیم، انسانی شخصیت کی نشو و نما میں، منفی قوت کی حیثیت سے عمل کرتی ہے؛ اور نوع انسان کو پیچھے کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ایک غیر تعلیم یافتہ انسان، غلط تعلیم یافتہ انسان سے بہتر ہے۔ اقبال کے نزدیک وہ «ناداں» جس کے جذبۂ حیات نے دین کے سانچے میں تربیت حاصل کی ہے، بہتر ہے اس عالم سے، جس کے دماغ نے نشو و نما کے مدارج طے کئے ہیں، لیکن جس کا جذبۂ حیات خفتہ، ملوث اور مسخ شدہ حالت میں ہے۔ اقبال تعلیم کے ناقص اور مریضانہ نظاموں پر اپنا یہ قطعی فیصلہ صادر کرتے ہیں:

ز من گیر ایں کہ مرد کور چشمے ز بیناے غلط بنیے نکوتر
ز من گیر ایں کہ نادانے نکو کیش ز دانشمند بے دینے نکوتر

جدید ترکی ادب

از

ڈاکٹر اکمل ایوبی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ترکی ایک سیدھی سادھی اور جامع زبان ھے۔ اس کا تعلق نہ تو عبرانی اور عربی جیسی سامی زبانوں سے ھے اور نہ سنسکرت اور فارسی جیسی آریائی زبانوں سے۔ یہ بذات خود ایک مستقل زبان ھے اور یورال الطائی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ھے جس کو تورانی خاندان بھی کہتے ھیں۔ اس وقت ترکی زبان کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً دس کڑوڑ ھے جو ولاڈی واسٹک سے لیکر یوگوسلاویہ تک پھیلے ھوئے ھیں۔ تاھم اس زبان کا قدیم ادبی سرمایہ ماضی کے پردے میں چھپا ھوا ھے۔ اب تک کی تمام دریافت شدہ قدیم تحریروں اور آثار قدیمہ کی دوسری شہادتوں سے صرف چھٹی صدی عیسوی کے ترکی ادب کے چند نمونے منظر عام پر آسکے ھیں۔ ترکوں نے انھیں نمونوں کی بنا پر یہ رائے قائم کی ھے کہ ان کا ابتدائی ادب خارجی اثرات سے پاک تھا اور یہ ان کے مخصوص رسم الخط میں تحریر کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ترکی زبان کے ذخیرے میں یونان کے خانہ بدوشوں کی بولیوں سے لیکر چین کے شمالی علاقوں کی زبان تک کے الفاظ شامل ھوتے گئے اور بعد میں اسلام کے حلقہ بگوش ھونے اور مسلم علاقوں میں ھجرت کرنے کی وجہ سے ترکوں نے اپنی مادری زبان میں عربی و فارسی زبانوں کے صرف الفاظ ھی شامل نہیں کئے بلکہ ان زبانوں کا طرز تحریر بھی اپنا لیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ ترکی زبان کی قدیم فطری خصوصیات بھی ختم ھوگئیں۔ اس وقت ترکوں کی تحریروں میں دوسری زبانوں کے الفاظ کی بھرمار ھوگئی تھی۔ ان کے معنی اور تصریف کے قاعدے بھی اصل زبانوں کے مطابق ھوگئے اور اُن کے اسماء اور افعال بجنسہ استعمال ھونے لگے اور وہ بھی اس کثرت سے کہ عبارت میں تکلف اور اجنبیت پیدا ھوجاتی اور زبان بوجھل بن جاتی تھی۔ ان اجنبی الفاظ، خیالات اور تصورات کے علاوہ ترکوں نے بڑی حد تک اپنے بہت سے اصل اور عام فہم الفاظ کو بھی عربی و فارسی لفظوں سے اس غرض سے تبدیل

کرلیا کہ ان کی تحریر شستہ، اور اسلوب بیان پرشکوہ بن جائے - اس رجحان نے یہاں تک ترقی کی کہ دولت عثمانیہ کے عہد زر کی زبان پر غیر ترکی، خاصکر عربی و فارسی عناصر بری طرح مسلط ہوگئے جس کی وجہ سے یہ غیر متعارف اور ادق طرز، ترکی کے کسانوں اور عام قصباتی عوام کی سمجھ سے بالا تر ہوگیا - اسی طرح ترکی شعراء نے بھی اپنی نظموں کی بحروں اور اسلوب بیان کو عربوں اور ایرانیوں کے مذاق کے مطابق ڈھال لیا تھا - چنانچہ یہ ادب زبان اور خیال دونوں ہی اعتبار سے مذاق جمہور سے الگ ہوگیا، اس پر تصنع اور نمائش کا شدید غلبہ تھا اور اس کی خوبی عبارت آرائی کو ہی سمجھا جاتا تھا - اس طرح ان کے یہاں فن پر زور تھا اور موضوع کی کوئی اہمیت نہ تھی - یہ ادب فطری احساسات اور آمد سے بھی عاری تھا- روایتی ہئیت کا سخت پابند تھا - چنانچہ اس کی بنیاد فقط لفظی صنعتیں تھیں - اس کے موضوعات عشق و عاشقی، حسن و جمال، بہار و گلشن، گل و بلبل کے قصے، وصل کے مزے اور فراق کے دکھڑے تھے یا جنگ و جدل اور سلاطین و وزراء کی مدح سرائی تھی - شعری ادب واقعیت سے کوسوں دور تھا اور لوگوں میں اجتماعی فکر پیدا کرنے کے نا قابل -

اٹھارھویں صدی کے آخر میں یورپ کی عام بیداری، صنعت و حرفت، علم و فن اور آداب و معاشرت کی ترقی نے ترکوں میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کردیا - فرانسیسی افکار اور فرانسیسی مذاق ادب نے ان کے خیالات اور طرز اداکو بہت متاثر کیا جس سے ان کا اسلوب بیان اور موضوع کلام بدلنا شروع ہوگیا - اس عہد کے بعض ارباب قلم نے اپنی سیاسی اور ادبی تنقیدوں، فلسفیانہ اور عمرانی مقالوں، ناولوں اور مغرب کی ادبی کتابوں کے ترجموں سے ترکی ادب کے طرز تحریر اور اسلوب بیان میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی کامیاب جد و جہد شروع کردی اور جلد ہی ان کا ادب اپنے خیالات اور طرز ادا کے لحاظ سے عربی فارسی اثرات سے کسی حد تک آزاد ضرور ہوگیا لیکن اب یہ فرانسیسی رنگ میں ڈوب گیا اور مغربی رجحانات و خیالات کی عکاسی ہی نہیں بلکہ نقالی کرنے لگا - اس طرح خارجی اثرات بدستور بر قرار رہے - ان اثرات کو پہلی جنگ عظیم اور انقلاب اتاترک نے ختم کیا[1] - غالباً اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ ترکی

---

[1] تفصیلات کے لئے راقم کا مضمون "ترکی زبان کے رجحانات کی اجمالی سرگذشت" دیکھئے جو رسالہ فروغ اردو - لکھنؤ کے شمارۂ دسمبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے -

ادب میں انقلابی شعور تنظیمات کے عہد میں شروع ہوچکا تھا لیکن اصل تبدیلی جنگ عظیم اور انقلاب اتاترک کے ذریعے آئی۔ اس نے ترکی کے نظام کہن ہی کو پاش پاش نہیں کیا بلکہ یہاں کے تمدن، معاشرت، سماج، اخلاق اور ادب پر بھی اثر ڈالا۔ اس اثر کو رسم الخط کی تبدیلی نے اتنا گہرا کردیا کہ ترکی تہذیب و تمدن کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔

اس نئے دور میں مشرق و مغرب کی وہ کشمکش ختم ہوجاتی ہے جو ایک عرصے سے ترکی میں جاری تھی اور ترکی ادب عربی، فارسی اور فرانسیسی ادب کی نقالی سے آزاد ہوکر ترکی کا ایک ایسا جدید قومی ادب بن جاتا ہے جس میں پھیلاؤ بھی ہے اور گہرائی بھی۔ اس جدید ترکی ادب کے علم بردار ترکوں کے مشہور مفکر ضیاگوک آلپ ہیں لیکن سربر آوردگی کا شرف رضا توفیق بواوک باشی کو حاصل ہے۔ بولوک باشی فلسفہ و تاریخ کے عالم، یورپی السنہ و ادب کے فاضل، سیاست کے ماہر، بے مثال خطیب اور بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں غنائیت، جذباتیت اور احساس کی شدت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہ جگہ جگہ پر اپنے فطری رنگ تغزل کا بھی خوب مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کو بکتاشی صوفیوں کے گیت بےحد پسند تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس رنگ میں بہترین رندانہ گیت لکھے ہیں۔ مذہبی احساسات کو نظم کا جامہ پہنانے کا کام محمد عاکف ارسوائے نے کیا ہے جو عروضی اوزان کے بےنظیر استاد تھے۔ وہ اپنے وقت کے بڑے خوش بیان واعظ، عمرانیات کی بعض کتابوں کے مصنف اور مذہب اسلام کے دل و جان سے حامی تھے۔ انہوں نے روزمرہ کی زبان میں گہرے مذہبی جذبات کے ساتھ قومی تحریک کے خلاف مضامین بھی لکھے اور اپنے سادہ و سلیس اشعار میں ترکوں کے زوال کا ماتم کرتے ہوئے اس کی اصل وجہ مذہب سے بیگانگی اور سچے ایمانی جذبات سے انحراف کو قرار دیا۔ ان کی باتیں اگرچہ نقارخانے میں طوطی کی آواز کے مانند تھیں، تاہم ان کی شاعری نے ان کو ایسی مقبولیت اور شہرت عطا کردی کہ ترکی جمہوریہ کا قومی ترانہ لکھنے کا شرف بھی انہیں کو حاصل ہوا جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

«ڈرو مت یہ سرخ پرچم جو شفق میں لہرا رہا ہے

اس وقت تک سرنگوں نہ ہوگا جب تک میرے وطن کے ایک بھی
گھر کے چولھے میں آگ روشن ہے۔
وہ میری قوم کا ستارہ ہے اور درخشاں رہے گا۔
وہ میرا ہے وہ صرف میری قوم کا ہے۔ »

ترکی ادب کے دور جدید کے بلند پایہ شاعروں میں ناظم حکمت اشتراکی ہونے کے باوجود اپنے زور کلام کی وجہ سے کافی ممتاز ہیں۔ ان کی نظمیں ہیئت اور انداز بیان کے نقطۂ نظر سے بڑی جاندار ہیں۔ مذہب پر کھلم کھلا حملے کی وجہ سے ان کی آواز ترکی ادب میں ایک الگ تھلک حیثیت رکھتی ہے۔ ان کو ترکی جمہوریہ کی حکومت نے سر زمین ترکی سے جلا وطن کردیا تھا اور ۱۹۵۱ء میں انہوں نے ماسکو میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ترکی میں ان کی تصانیف کی اشاعت بھی ممنوع قرار دے دی گئی ہے پھر بھی ان کی قدر و قیمت کم نہیں ہوئی اور آج بھی ان کی شاعری قابل تقلید نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے سرمایہ داروں اور ان ادیبوں کے خلاف آواز اٹھائی جو سرمایہ داروں کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کے حقائق کی تلخی اور امیدوں کی مستی روح کو تڑپاتی اور دل کو گرماتی ہے۔ انہوں نے قدیم ادبی روایات میں « تجدد » میں پیدا کرنے کے لئے نظم معری اور بحر ہجائی کا بھی استعمال کیا ہے۔ ان کی بعض نظموں کی بحریں اتنی چھوٹی ہوگئی ہیں کہ ایک پورے مصرعے میں صرف ایک ہی لفظ ملتا ہے۔ تاہم اس میں ایسی دلنواز موسیقی ہے جو دلنشیں بھی ہے اور زندگی بخش بھی۔ ناظم حکمت نے ترکی کے اس سماج کی سچی مصوری کی ہے جس سے خود ان کا واسطہ پڑچکا ہے اس لئے ان کی کھینچی ہوئی تصویروں سے وہ لوگ زیادہ لطف اٹھاسکتے ہیں جو ابھی تک ناظم حکمت زمانے کو نہیں بھولے ہیں۔ انہوں نے روز مرے، محاورے، ضرب الامثال اور تمثیلات سے زبان کو مالا مال کردیا ہے۔

ناظم حکمت کو ہندوستان آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن ہندوستان اور ہندوستانیوں سے ان کو بہت لگاؤ تھا اور اس کا اظہار انہوں نے اپنی متعدد نظموں میں کیا ہے۔ ان کی ایک بڑی اچھی رزمیہ نظم کلکتہ کے ایک انقلابی، مسٹر بنرجی سے متعلق ہے۔ اس نظم میں جو پہلی بار ۱۹۳٤ء میں شائع ہوئی تھی، ناظم حکمت نے انگریزی حکومت کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ میرے خیال میں ان کی سب سے اچھی نظم وہ ہے

جس میں انھوں نے مغربی اقوام کو یہ بتایا ہے کہ مشرق کیا ہے اور جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

«راز ہائے سربستہ

قناعت

قسمت

سرائے

کاروان

چاندی کے تھال میں ایک شہزادی ناچتی ہوئی۔

مہاراجہ

بادشاہ

ہزاروں برس کا بوڑھا درویش

ایک عورت ناک پر مہندی لگائے۔ پیر سے کپڑا بنتی ہوئی۔

سبز داڑھی کا امام، منار پر اذان دیتا ہوا

یہ مشرق!

نہ پہلے تھا نہ اب ہے، نہ کبھی ہوگا۔

مشرق وہ ملک ہے جہاں ننگے مزدور محنت کا پسینہ بہاتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔

مشرق وہ سر زمین ہے جو ہر قوم کی ملکیت ہے سوائے خود اہل مشرق کے»

ناظم حکمت کے بعد ترکی کے بلند پایہ شاعروں میں یحییٰ کمال بیاتلی کا نمبر آتا ہے جن کو ہمہ گیر مقبولیت حاصل ہے۔ ان کو حقیقت نگاری، فطرت کی تصویر کشی اور تاثرات کی مصوری میں کمال حاصل تھا جس سے ان کی غزلوں اور رباعیوں میں بلندی اور سادگی، ترنم اور لطافت اس طرح مل جل گئی ہیں جیسے چراغ میں روشنی اور گرمی۔ انھوں نے «فن برائے فن» کے شعار کو بدستور قائم رکھا اور کلاسیکی شاعری کی تقلید میں وزن اور قافیہ کا احترام بھی کیا لیکن نئے خیالات کے اظہار کے لئے نئی تشبیہوں اور نئے استعاروں کا بھی سہارا لیا ہے۔ انھوں نے وزن کی تقسیم اور قافیوں کی ترتیب میں البتہ اختراع سے کام لیا ہے جو دوسرے اچھے شعراء نے بھی قبول کرلیا ہے جن میں فاروق نافذ چملیبل، احمد حمدی تانپینار، نجیب فاضل کیساکوریک اور احمد موحیف دراناس کے نام سرفہرست ہیں۔

یحییٰ کمال بیاتلی پاکستان میں ترکی کے پہلے سفیر بھی مقرر ہوئے تھے اور اس ملک میں ان کا قیام ایک سال سے زیادہ رہا - اس دوران میں وہ وہاں کے ادبی حلقے میں کافی مقبول ہوگئے تھے - غالباً یہ اسی مقبولیت کا اثر ہے کہ سابق پاکستانی سفیر متعینہ ترکی جمہوریہ، میاں بشیر احمد نے ان کی ایک نظم کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے جو درج ذیل کی جاتی ہے[1]- اس سے یحییٰ کمال بیاتلی کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ہوجائے گا -

خاموش جہاز

دنیا سے جب آجاتا ہے رخصت کا زمانہ — ہوتا ہے جہاز ایک کنارے سے روانہ
جاتا ہے کدھر کو یہ کسی کو نہیں معلوم — حیراں ہے نظر، عقل ہے اس علم سے محروم
خاموش ہے گویا کہ مسافر نہیں کوئی — یعنی کہ نشاں زیست کا ظاہر نہیں کوئی
رخصت کے لئے ہاتھ اُٹھایا نہ کسی نے — رومال بھی ساحل سے ہلایا نہ کسی نے
پس ماندوں کی حالت ہے نہایت ہی المناک — دن رات اُفق پر ہے نظر آنکھ ہے نمناک
اور اس پہ ستم یہ، ہیں ستم اور بھی باقی — زندوں کے لئے حیف ہیں غم اور بھی باقی
محبوب چلے جاتے ہیں دلگیر نہ کیوں ہوں؟ — فرقت ہے غضب شاکی تقدیر نہ کیوں ہوں؟
کیا دیکھتے ہیں کاش کوئی ان کو بتائے — اس جا سے گئے جو کبھی واپس نہیں آئے
واپس نہیں آئے کبھی برسوں سے مسافر — جس جا ہیں وہاں شاد ہی ہونگے نہ وہ آخر[2]

دو اور ترک شاعر جن کا ابھی کچھ سال پہلے انتقال ہوگیا ہے ایسا کلام چھوڑ گئے ہیں جو عرصہ تک عوام میں مقبول رہےگا - ان میں ایک جاہد صدقی ترنجی ہیں جن کی زبان ایسی سادہ اور فطری ہے جس میں زور بھی ہے اور تاثیر بھی - دوسرے اورخان ولی کانک ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں تعمیری اور معاشرتی رجحانات کی بھی ترجمانی کی ہے اور زبان کی سادگی و مکالمانہ انداز بیان کے ذریعہ سے شاعرانہ حسن پیدا کیا ہے - ان کے علاوہ ترکی کے جمہوری دور کے ممتاز شعراء میں سے

---

۱ اس نظم کا اصل ترکی عنوان « سسزمگی » ہے -

۲ یہ ترجمہ مجھے قیام ترکی کے دوران ترکی میں پاکستانی سفارت خانے (انقرہ) سے حاصل ہوا تھا - اس کے لئے میں اس سفارت خانے کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں -

اورخان سیفی اورخان، یاشرنبی نائیر، بہجت، ملیح جیودت، فاضل حسنو داغ لارجا، بدری رحمی ایوب اوغلو، اوکتائے رفعت، کمال الدین کامو، آصف خالد چلیبی، اتیلہ الحان، صباح الدین قدرت اکسل بھی قابل ذکر ھیں۔

اس وقت ترکی کے شعراء الفاظ کا رشتہ حقیقت سے جوڑنے کی ضرورت محسوس کرتے ھیں۔ وہ زندگی کے تمام سماجی، معاشی اور تہذیبی پہلوؤں کو امکانی حد تک واقعیت پسندانہ اور فنکارانہ طور پر بیان کرنے کی کوشش کرتے ھیں۔ عہد عثمانیہ کے قدیم شاعروں کی طرح وہ سیاسی، سماجی اور معاشی قدروں سے جی نہیں چراتے اور حقیقت سے دور ان طلسمی وادیوں میں نہیں گھومتے رھتے جن میں عام انسانوں کا کبھی گذر نہ ھو۔ وہ جمہور کے درمیان رھتے ھیں اس لئے اپنے کلام میں ان کو جگہ دیتے ھیں اور ان میں تنقید کی قوت اور اجتماعی فکر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ھیں۔ ان کی شاعری کے اوزان، اصناف اور موضوعات بھی اب بدل گئے ھیں۔ پھر بھی کئی حیثیتوں سے یہ قدیم شعر و شاعری ھی کا ایک تسلسل ھے۔ ڈراما، ناول اور افسانہ البتہ ان کے لئے بالکل نئی چیزیں ھیں۔ اس کے باوجود ان کے بعض شاھکاروں کی شہرت بیرونی دنیا تک پہنچ گئی ھے اور ترکی کے باھر ان کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی ھے۔

معاصر ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں میں خانم خالدہ ادیب ادیوار کا شمار صف اول کے ادیبوں میں ھوتا ھے۔ ان کی تین ناولیں «ینی توران» «آتش تن گوملک» اور «ھاندان» اپنی مثالی سیرت نگاری اور طرز ادا کی وجہ سے کلاسیکی ادب میں شمار ھونے لگی ھیں۔ ان میں ترکوں کی جنگ آزادی کی کیفیت بیان کی گئی ھے اور ترک ان ناولوں کو بہت پسند کرتے ھیں لیکن انسانی جذبات کی دھوپ چھاؤں دکھانے کی صلاحیت کا اصل مظاھرہ یعقوب قادری قارہ عثمان اوغلو نے کیا ھے۔ ان کی ناولیں خالدہ ادیب ادیوار کی طرح صرف انگریزی زبان ھی میں نہیں بلکہ روسی، فرانسیسی، المانی، اطالوی زبانوں میں بھی ترجمہ ھوچکی ھیں، جو اپنی زبان، پلاٹ، کردار نگاری اور حقیقت نگاری کی وجہ سے بہت مقبول ھیں۔ ان کی ایک ناول «نور بابا» نامی نے ترکی میں اچھا خاصہ ھنگامہ برپا کردیا تھا۔ اس میں انھوں نے بکتاشی سلسلے کی اندرونی زندگی کو بے نقاب کیا ھے اور ان کی ابہام پسند رسومات پر سخت حملے بھی کئے ھیں۔ ان

کی دوسری مشہور ناول کا عنوان « یابانجی » ہے جس میں ترکی کے گاؤں کی آفت زدہ زندگی کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔

خالدہ ادیب ادیوار اور یعقوب قادری قارہ عثمان اوغلو کو ترکی کے باہر کافی مقبولیت حاصل ہے لیکن ترکی میں جس شخص نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ رشاد نوری گونتکن ہیں ۔ یہ تیس ناولوں اور ڈراموں ، چار مختصر افسانوں کے مجموعوں ، سات تراجم اور کچھ علمی تصانیف کے مالک ہیں ۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ڈرامے کے نقاد کی حیثیت سے کیا اور یورپ کے ڈراموں کی وسیع معلومات حاصل کرنے کے بعد خود کامیاب ڈرامے لکھے اور بعض مغربی ڈراموں کو اس طرح اپنایا کہ ان کے ہیروؤں کو بطور نمونے کے ترکی بساط پر بٹھا دیا ۔ اس کامیابی کے بعد انھوں نے ناول اور افسانے لکھنا شروع کئے اور جلد ہی مقبول عام ہوگئے ۔ ان کی دو ناولوں کا انگریزی زبان میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے جو ہر حیثیت سے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی ناولوں کی ٹکر کی ہیں ۔ ان کی سب سے زیادہ مشہور ناول « چالی قوشو » ہے جس میں اس عہد کے سماج کی مکمل تصویر ملتی ہے ۔ اس ناول میں گونتکن نے مفصلات کی ایک ایسی خود سر معلمہ کی سیرت بیان کی ہے جو عین شادی کے دن اپنے منگیتر سے عقد کرنے سے انکار کردیتی ہے ۔ یہ خود سر لڑکی اناطولیہ میں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے جہاں اسے کئی حادثات پیش آتے ہیں ۔ بالآخر وہ واپس آکر اپنے اسی منگیتر سے شادی کرلیتی ہے ۔ اس ناول کا موضوع ، جو تقریباً چار سو صفحات میں بیان کیا گیا ہے ، سیدھا سادھا ہے اور فن کی حیثیت سے اس میں کچھ خامیاں بھی ہیں لیکن اس کے باجود یہ ناول سر تاپا ترکی ہے ۔ اس میں اناطولیہ کے دیہات کے متوسط اور اونچے طبقے کی کیفیتوں ، بہار کی رنگینیوں اور موسم خزاں میں وہاں کے باشندوں کی سرمستیوں کا دلکش بیان ہے ۔ انسانی جذبات ، نفرت اور غصہ کا تلاطم ، ہیروئن کا زندگی کی بھول بھلیوں میں مایوس اور ناکام بھٹکتے پھرنا اور ہیرو کے گہرے اور سچے جذبات کا بیان اتنا حقیقی اور پرلطف ہے کہ پڑھنے والا اسے ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

ارجمند اکرم تلو بھی اپنی موثر حقیقت نگاری کی وجہ سے بہت مشہور ہیں ۔ ان کے بعض افسانے اور چند ناولیں پڑھنے کے قابل ہیں ۔ موجودہ دور کے ناول نگاروں میں یوں تو آقا گوندوز ، پیام صفا ، جلال الدین ، سواد درویشی ، محمود یساری ، کریمہ نادر ،

شناسی حصار ، کمال طاہر ، اورخان کمال ، عبدالحق حصار ، اتیلاالحان ، اور افسانہ نگاروں میں صباح الدین علی ، اقبال ، حسین کمال ، سعید فائک ، عزیز اور خلدون‌تونر بھی قابل ذکر ہیں لیکن ارجمند اکرم تلو کی شخصیت اپنی فنی صلاحیت ، زبان کی خوبی اور شعور کی بلندی کی وجہ سے ان سب سے علیحدہ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے ۔ انھوں نے اپنی ناول « کان و ایمان » نامی میں ان ترک خواتین کی جانبازی اور قربانی دکھائی ہے جنھوں نے اپنے بہادر شوہروں کے دوش بدوش اتاترک کے پرچم کے نیچے لڑکر حق رفاقت ادا کیا ہے ۔ ان کی ناول « گوش‌باترکن » ایک ایسا معاشرتی افسانہ ہے جس میں حقیقت ، فن اور اخلاقی درس باہم سمو دئے گئے ہیں ۔ ان‌کی ایک اور کتاب « مینی اولیا » بھی قابل ذکر ہے جو سترھویں صدی کے مشہور مورخ و سیاح اولیا چلیبی کے « سیاحت نامہ » کی مزاحیہ نقل ہے ۔ اس کا منظر استانبول ہے اور اس میں نئی نئی اختراعات اور بودوباش کے نئے نئے طریقوں کا بہت کامیابی کے ساتھ، خاکہ اُڑایا ہے ۔ لیکن اس کامیابی کے باوجود ان‌کو ترکی مزاحیہ نگاری کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا ۔ اس فن کے ممتاز نمائندے رفیق خالد کرائے ہیں ۔

رفیق خالد کرائے کوفن مزاح و طنز میں غیر معمولی قدرت حاصل ہے ۔ وہ استانبول کی اس روزمرہ استعمال کی ترکی زبان سے ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کا کام لیتے ہیں جو سادہ ہونے کے ساتھ شیریں اور محاوروں سے مالامال ہے ۔ انھوں نے اپنے چبھتے ہوئے انداز بیان سے « نوجوان ترکوں » پر خوب خوب حملے کئے ہیں اور سیاست میں ان سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کا بھی خوب مذاق اُڑایا ہے ۔ ظرافت کے ساتھ ساتھ ان‌کو قصہ لکھنے کا سلیقہ بھی خوب آتا ہے ۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں ترکی زندگی کے خدوخال کی مصوری حقیقت نگاری کے موے قلم سے کی ہے جن‌کے رنگوں میں باسفورس میں غروب آفتاب کا منظر نظر آتا ہے ۔ ان کی اس صلاحیت نے ان کو ظرافت کا استاد بنا دیا ہے ۔ ترکی کے قدیم مورخ نائمہ کی عبادت کی مزاحیہ نقل کرتے ہوئے انھوں نے دستوری حکومت[1] کے خاص خاص افراد اور واقعات کا بھی خوب خوب خاکہ اُڑایا ہے ۔ ان کی مشہور کتاب « مملکت حکایہ لری » کے موضوعات زیادہ تر زندگی کے وہ پہلو ہیں جو مکروہ اور حقیر خیال کئے جاتے ہیں لیکن ان‌کے طریفانہ استعارے ،

---

۱ دیکھئے راقم کی کتاب « ترکی » (سنہ ۱۹۶۳ء دہلی) جو ادارۂ علوم اسلامیہ‌کی طرف سے شائع ہوئی ہے ۔

کنائے اور چلتے ہوئے فقرے ہنسی کی گدگدی ضرور پیدا کردیتے ہیں۔ یہ فن اس وقت ترکی میں تیزی سے ترقی کررہا ہے اور ترکی کے ظریفانہ رسالوں اور اخباروں میں یوسف ضیا، فضل احمد آئے کاچ، خلیل نہاد بوزتپہ، ابراہیم علاءالدین، عثمان جلال، جمال نادر وغیرہ کی ظریفانہ صحافت کے نمونے نظر آتے رہتے ہیں۔

ایک اور بڑی اچھی اٹھان کا نوجوان ادیب محمودمکال ہے جو اس وقت پانچ کتابوں اور متعدد مقالوں کا مصنف ہے۔ یہ ترکی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کی کتابوں کے آئینہ میں مزارعین کے اس طبقے کے مصائب آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں جو ترکی جمہوریہ کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہے اور پھر بھی مظلوم ہے۔

لیکن سب سے زیادہ ترقی کے آثار اس وقت ترکی علمیت و فضیلت میں نظر آتے ہیں۔ آج سے ساٹھ سال پہلے یہاں کوئی تاریخ کی کتاب یا سوانح عمری علمی اصولوں پر نہیں لکھی گئی تھی۔ تاریخ کی کتابیں عموماً تالیفات ہوا کرتی تھیں جن میں تحقیق نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اب نجیب عاصم، احمد رفیق، ذکی ولیدی طوغان، انور ضیاکارال، طارق تونایا، عثمان توران، جمال توکین وغیرہ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس صنف ادب میں ترکوں نے کس قدر ترقی کرلی ہے۔ اسی طرح سے ترکی زبان و ادب پر تحقیق و تنقید کا کام کرنے والوں میں حسن‌علی یوجل، حسین جاهد یالچن، محمد طاهر، نہاد سمیع بنرلی، اسمعیل حبیب سیوک، نوراللہ آتش، احمد یمین یلمان، احمد حمدی تانپینار، شناسی حصار، فواد کوپرولو اور مصطفی نہاد کی پیش‌کردہ تصانیف قابل ذکر ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے یہ بھی امیدکی جاسکتی ہے کہ ان کے نکھرے ہوئے تحقیقی و تنقیدی شعور کی وجہ سے ترکی جمہوریہ میں اور اچھا ادب پیدا ہوگا۔

ادب میں شخصیت

از

جناب شمس الرحمٰن فاروقی ، الہ آباد

ایک بہت پڑھے لکھے ، اس سے زیادہ ذہین ، اور دیدانت کے فلسفے سے شغف رکھنے والے دوست سے گفتگو ہورہی تھی - کہنے لگے کہ زندگی میں ہر چیز سے بے تعلقی پیدا کرو ، ہر چیز کو باہر سے دیکھو ، الگ سے دیکھو ، تب صحیح نظریۂ زندگی حاصل ہوسکے گا اور سچی خوشی نصیب ہوگی - میں نے اپنی ایک نظم کا ذکر کیا جو ان کو بہت پسند ہے اور کہا کہ اگر بے تعلقی (detachment) اور ترک ارتباط ہوتا تو یہ نظم کیسے پیدا ہوتی ؟ کہنے لگے کہ گیتا ، انجیل ، اور قرآن بھی تو عظیم شاعری ہیں ، اور یہ بھی تو بے تعلقی اور ہر چیز کی اصلیت کو باہر سے دیکھنے (objective appreciation) سے ظہور میں آئی ہیں - میں نے جواب دیا کہ یہ میں نہیں کہتا کہ اپنی ذاتی شخصیت کو پس پردہ ڈال دینے ، اپنے معتقدات اور رجحانات اور تعصبات کو بھلا دینے اور ہر تجربۂ کو بے تعلقی سے پرکھنے سے عظیم ادب نہیں پیدا ہوتا ، لیکن عظیم ادب اس بے تعلقی کی غیر موجودگی میں بھی پیدا ہوسکتا ہے - اگر ایسا نہ ہوتا تو عشقیہ شاعری یا مذہبی شاعری میں عظمت کے عناصر نہ ملتے ، اور اس کے علاوہ جس چیز کو آپ شاعری سے تعبیر کررہے ہیں وہ شاید زیادہ تر قوت بیان اور لفاظی (Eloquence) کا نام ہے ، جو کہ شاعری کا جز ہے کل نہیں -

مغربی اصول تنقید نے ، جس کی رُو سے ڈراما ادب کی اعلیٰ ترین تمام مثال ہے ، اس بے تعلقی کو بڑی اہمیت دی ہے - کیٹس نے اسی اصول کو یوں بیان کیا تھا کہ شاعر کی شخصیت سب سے زیادہ غیرشاعرانہ ہوتی ہے - اس کی مراد یہ تھی کہ شاعر کا ذہن خود بے رنگ ہونا چاہئے ، تاکہ وہ خارجی اور داخلی دنیا کے تجربات کے تمام رنگوں کو قبول کرسکے ، اگر شاعر کا ذہن خود کسی خاص رنگ یا رجحان میں رنگا ہوا ہے اور وہ عمل تخلیق کے وقت اس رجحان کو نظر انداز نہیں کرسکتا یا پس پشت نہیں

ڈال سکتا تو وہ اچھا شاعر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اصول بذات خود بہت کارآمد اور موثر ہے۔ آج کل کے ادیب جس طرح مختلف نظریات اور معتقدات کے اسیر ہیں اور ان کے ادب پر ان معتقدات کا اثر جس قدر تباہ کن اور جمود افزا ہے وہ ہم سب پر ظاہر ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا ذہن صرف ایک طرح کے تجربات اور محسوسات کا اثر قبول کرکے باقی کو رد کردیتا ہے اور ان کی شاعری یک رنگ ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال فیض یا سردار کی شاعری ہے۔ فیض کے یہاں تو خاص طور پر شعری مضامین کی اس قدر کمی ہے کہ آپ ان کی تقریباً ہر نظم کا خلاصہ دو چار نظمیں غور سے پڑھ کر لکھ سکتے ہیں۔

اس کلیہ سے انکار نہیں کہ شاعر کی شخصیت اگر مختلف تجربات کا اثر قبول کرنے پر قادر ہو (اور ظاہر ہے کہ یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب خود اس کے ذہن میں کسی بھی نظریہ یا اصول کی جڑیں گہری اور مضبوط نہ ہوں) تو وہ بڑی شاعری کا اہل ہوتا ہے۔ لیکن گیتا اور انجیل وغیرہ کی جو مثال میرے دوست نے دی وہ اس لئے قابل قبول نہیں کہ ان کتابوں کی (مذہبی اہمیت سے کوئی بحث نہیں) ادبی اہمیت اس وجہ سے نہیں ہے کہ انہیں ایک بے تعلق (Detached) اور ہر مسئلہ کو اندر اور باہر سے (اس مسئلہ میں خود ملوث ہوئے بغیر) دیکھنے والی شخصیت نے تخلیق کیا ہے یا کیا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادبی اور فلسفیانہ یا نفسیاتی یا اخلاقی مسائل کی اہمیت اور نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اس نکتہ کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے اور کم ہی لوگوں نے سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ابسن (Ibsen) کے نقش قدم پر چلنے اور اس کی طرح مسائلی ڈرامے (Problem Plays) لکھنے والے برنارڈ شا کی بھی نظر اس طرف بھرپور نہ گئی اور اسی وجہ سے وہ سماجی مسائل کو ادبی مسائل سمجھتا رہا۔ یہ درست ہے کہ گیتا اور اس طرح کی دوسری کتابوں میں بہت سے اخلاقی اور فلسفیانہ مسائل سے بڑی دقیق بحث کی گئی ہے اور بحث کا انداز انتہائی غیرجانب دارانہ یعنی (detached) ہے لیکن صرف اس وجہ سے کہ یہ کتابیں نظم یا نظم منثور میں ہیں اور ان میں خود مصنف کی شخصیت کا پتہ نہیں چلتا، ان کو عظیم ادب قرار دینا بڑی غلطی ہوگی۔ اگر اس اصول سے پرکھا جائے تو افلاطون کے مکالمات، ایڈم سمتھ (Adam Smith) کی شہرۂ آفاق اقتصادیات پر کتاب کو بھی کیوں اس درجہ سے محروم رکھا جائے؟

کوئی بھی مسئلہ ہو، اخلاقی یا نفسیاتی یا فلسفیانہ، جب ادیب اور خاص کر شاعر یا ڈراما نگار اس کو برتتا اور پرکھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہ غیرشخصیت (Impersonality) برقرار رہے جو ہم عظیم ڈراما نگار سے چاہتے ہیں تو وہ اس مسئلہ کو Abstract سے اتارکر Concrete کی سطح پر لے آتا ہے، اس کو افراد و واقعات اور حالات کی حدوں میں مقید کرتا اور پھر اس کو سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو محض مسئلہ یا نظریہ یا اصول، چاہے کتنی ہی زور دار اور خوب صورت زبان میں بیان کیا جائے، ادب کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ اس وجہ سے میں مکالمات افلاطون یا مثنوی مولانا روم یا «اسرار خودی» کو عظیم یا مکمل ادب نہیں مان سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بڑا شاعر کبھی مسائل کو حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا کیوں کہ جن مسائل کو وہ ادب کی گرفت میں لانا چاہتا ہے ان کو حل کرنے کی کوشش تحصیل حاصل ہوتی ہے۔ وہ صرف ہماری شخصیت اور ذہن کو (اور شاید اپنی شخصیت اور ذہن کو بھی) ان مسائل کی طرف اور زیادہ بیدار اور حساس بنا دیتا ہے۔ اگر وہ اس انداز میں مسئلہ کا مقابلہ کرے گویا وہ اس کا حل جانتا ہے، تو وہ شاعر نہیں، اور جو کچھ بھی ہو۔ فرض کیجئے کہ مسئلہ یہ ہے سچائی کسے کہتے ہیں؟ ذاتی سچائی اور عوامی یا غیر ذاتی سچائی میں کیا فرق ہوتا ہے؟ انسان کے سچائی کی طرف کیا فرائض ہیں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ اسے اگر جھوٹ کو ظاہر کرنے اور سچ کو چھپانے کا موقع دیا جائے تو وہ ہمیشہ سچ کو ظاہر ہی کردے؟ اس مسئلہ پر اگر آپ Abstractness کی سطح پر ہزاروں صفحات بھی سیاہ کردیں تو میں آپ کو ادیب یا فن‌کار نہیں مان سکتا۔ فرض کیجئے کہ آپ ایک جج یا وکیل ہیں اور آپ کے سامنے ایک ایسے شخص کا مقدمہ ہے جس نے جھوٹ کو اس لئے ظاہر کیا اور سچ کو اس لئے دبایا کہ اس میں ایک خاندان یا قوم کی بھلائی تھی اور نقصان کسی کا نہیں تھا۔ آپ اس شخص کی مدافعت میں یا اس کو سزا دیتے وقت جو کچھ بھی کہیں یا لکھیں، آپ ادب کی تخلیق ہرگز نہیں کررہے ہیں۔ اب آپ اس مسئلہ کو یوں دیکھیں: ایک عورت جو اعلیٰ کردار اور اچھی شکل صورت کی مالک ہے اور ایک اچھے مگر غریب خاندان سے ہے اور جس کا شوہر ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہے، ہر طرف سے نا امید

ہوکر ایک چھوٹا سا جھوٹ بولتی ہے۔ وہ ایک شخص پر یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کا باپ زندہ ہے اگرچہ بستر مرگ پر ہے ، اور اس کی موت کے بعد وہ گراں قدر مال و متاع کی مالک ہوگی۔ اس بے ضرر لیکن بظاہر مجرمانہ جھوٹ کے سہارے وہ اس سے قرض لیتی ہے اور اپنے شوہر کا علاج کرتی ہے۔ شوہر تندرست ہوجاتا ہے اور جلد ہی ایک بڑی حیثیت کی نوکری پر فائز ہوجاتا ہے۔ جس شخص سے اس نے قرض لیا تھا اسے وہ آہستہ آہستہ پیسے واپس کرتی رہتی ہے۔ ایک موقع ایسا آتا ہے کہ وہ اپنے شوہر پر یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے کہ اس نے جھوٹ بول کر ایک بدنام زمانہ شخص سے قرض لیا تھا اور وہ اب اس سے اپنے قرض کی واپسی کے علاوہ کسی اور مستقل فائدے مثلاً نوکری میں ترقی کا متقاضی ہے۔ ایسے موقع پر وہ کیا کرسکتی ہے ؟ اگر سچائی ظاہر ہوجائے تو اس کے لئے گھریلو زندگی کی تباہی اور آنسوؤں اور شکستہ دلی کے سوا کچھ بھی نہیں ، کیوں کہ اس کا شوہر خود غرض ، کم نظر اور اپنی جھوٹی عزت کی پرستش کرنے والا انسان ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اسے ایک ایسے آدمی کی سفارش کرنی پڑتی ہے جس کا تقرر کرنے سے اس کے شوہر پر حرف آسکتا ہے۔

وہ سچ کو ظاہر کردیتی ہے اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مسئلہ کی تحقیق و تفتیش یہیں ختم ہوجاتی ہے ، اور یہ فن کارانہ حیثیت سے ہر طرح مکمل ہے۔ میرے خیال میں آپ سب پر ظاہر ہوگا کہ یہ ابسن کے ایک شہرۂ آفاق ڈرامے کا خلاصہ ہے۔ اس مسئلہ سے ابسن نے بار بار بحث کی ہے اور مختلف واقعات اور حالات اور کرداروں کے ساتھ۔ لیکن اس کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ خود اس کی رائے اس کے بارے میں کیا ہے۔ یہ کام وہ سیاست دانوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور شاید ہم سب کو اپنی اپنی رائے اور فیصلے پر مختار کردیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ابسن خود اس عورت کو کوئی اور راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ، یا اس عورت کے اس فیصلہ پر مرحبا کہتا۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم اور یہی اعلیٰ فن کار کی غیرجانب داری اور بے تعلقی ہے۔

ایک نفسیاتی اور سماجی مسئلہ لیجئے : ایک سفید نسل کی اعلیٰ خاندان لڑکی ایک سیاہ نسل کے مرد سے محبت کرنے لگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آج کے روشن خیال دور میں ایسا مشکل سے ہوتا ہے اور بہت اچھا نہیں سمجھا جاتا تو آج سے صدیوں

پہلے یہ حادثہ کتنا انوکھا اور اہم ہوگا۔ فن‌کار کو اس سے بحث نہیں کہ لڑکی کا اس طرح گرفتار بلا ہوجانا اچھا ہے کہ برا۔ اس کو اس مسئلہ سے ضرور دلچسپی ہے کہ ایسا کیوں کر ہوسکا ہوگا؟ اور پھر اس عالم میں اس لڑکی کا آئندہ فعل کیا ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خود اگر کسی ایسی لڑکی کے مسئلہ سے دو چار ہوتا تو اس کو دم مار کر بیٹھ رہنے کی راے دیتا، یا اس کو اس فعل کے برے نتائج سے آگاہ کرتا۔ لیکن یہ کام اس کا نہیں۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ جس طرح کی لڑکی کا خاکہ اس کے ذہن میں ہے وہ ایسے موقع پر کیا کرتی؟۔ وہ یہ طے کرتا ہے کہ خاندان اور رسم و رواج، ماحول اور روایت سے بغاوت کرکے وہ لڑکی اس سیاہ فام مرد سے شادی کرلیتی۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ حسد کا جذبہ کس طرح مرد کے دل میں جگایا جاسکتا ہے اور اسے کون کیوں کر جگاسکتا ہے؟ وہ ایک کردار کی تخلیق کرتا ہے جس کی اخلاقی شخصیت کے بارے میں اس کی کوئی راے نہیں۔ وہ کیوں بظاہر بے وجہ ایک خوش و خرم شوہر بیوی کے درمیان نفرت اور حسد اور جلن اور بے اطمینانی اور بے اعتمادی کا زہریلا بیج بوتا ہے، اس مسئلہ پر بھی اس کی کوئی راے نہیں، کیوں کہ یہ مسئلہ در حقیقت کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، جس طرح یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ فلاں کی ناک لمبی کیوں ہے؟ یہ محض ہستی انسان کی ہزارہا نیرنگیوں میں سے ایک ہے۔ پھر وہ یہ سوچتا ہے کہ جس مزاج کا وہ سیاہ فام مرد حامل ہے پھر ایسی حالت میں کیا کرتا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ مرد عورت کو قتل کر دیتا۔ کس طرح قتل کا فعل عمل میں آتا اور اس کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے پہلے اسے کن ذہنی مراحل سے گذرنا پڑتا؟ یہ مسئلہ ضرور اس کے فن‌کارانہ عمل کے دائرہ میں ہے۔ مگر یہاں بھی وہ یہ نہیں کہتا کہ ہر سیاہ فام مرد یہی کرتا، اور یہ تو ہرگز نہیں کہتا کہ ہر سیاہ فام یا سفید فام مرد کو یہی کرنا چاہئے۔ پھر وہ یہاں آکر اپنے تجزیہ کو ختم کرتا ہے کہ قتل کے بعد وہ سیاہ فام مرد کیا کرتا؟۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ «اوتھیلو» (Othello) کی تلخیص ہے جو میں نے پیش کی ہے۔

اب غالباً اس مسئلہ کی نوعیت بھی ذرا زیادہ واضح ہوگئی ہوگی کہ ادب کی دنیا میں مسائل کی حیثیت فلسفیانہ یا نفسیاتی مسائل کی نہیں ہوتی۔ ماہر نفسیات تو یہ طے

کرتا کہ مندرجۂ بالا حالت میں کوئی مرد کیا کرتا، یا زیادہ سے زیادہ اپنے کو اتنا محدود کرتا کہ کوئی سیاہ فام مرد کیا کرتا؟۔ فلسفی یہ طے کرتا کہ سیاہ فام (یا سفید نام، اس سے اس کو زیادہ غرض نہیں) مرد کا یہ فعل درست تھا کہ نہیں، اور اسکے لئے کیا جواز یا اس میں کیا حسن و قبح پایا جاسکتا ہے؟۔ یا وہ پھر اس بات سے بحث کرتا کہ غلط فہمی اور حسد اور جلد بازی اچھی ہوتی ہے یا بری۔ شیکسپیر کو ان باتوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ فن کو اس طرح محدود نہیں کرنا چاہتا۔ اور نہ وہ آپ پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے اوتھیلو یا ڈس‌ڈمونا کے خیالات و نظریات سے اتفاق ہے یا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ خود کو اوتھیلو کی شخصیت میں ضم کردیتا ہے، اوتھیلو کو اپنی شخصیت میں نہیں۔ اسی وجہ سے شیکسپیر کے کردار اس قدر واقعیت سے بھرپور اور اصلیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کو سمجھنا یا ان کے عوامل و محرکات کو متعین کرنا، ان کی سراسر تعریف کرنا یا ان کی برائی کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

ڈراما کے فن‌کار کے لئے اس کے علاوہ منتہائے کمال کوئی نہیں کہ وہ اپنے کرداروں سے وہی یک‌سوئی اور بے تعلقی پیدا کرلے جو ایک باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ جس طرح باپ یہ نہیں طے کرسکتا کہ اولاد کی جنس یا شکل یا صورت یا اخلاق کیا ہوں گے اگرچہ وہی اس کو پیدا کرتا ہے اور اسکے دنیا میں آنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ویسے ہی ڈراما نگار اپنے کسی کردار کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں دے سکتا کہ وہ اچھا آدمی ہوگا یا برا۔ اسکے قاری کو اس سے محبت ہوگی یا نفرت، اور جو خواص و عادات وہ اس میں ودیعت کررہا ہے، وہ اچھے ہیں یا برے۔ وہ یہ ضرور ارادہ کرسکتا ہے کہ اسے کسی خاص مسئلہ کو برتنا یا جانچنا ہے، اور اس مسئلہ کو پرکھنے اور برتنے کے لئے بہترین صورت (Form) اور ذریعہ (Means) کیا ہوسکتا ہے۔ اگر وہ اس سے زیادہ کچھ اور بھی پہلے سے طے کرلے تو ڈرامے کی ناگزیری کا خون ہوجائے گا، یا پھر وہ بڑی حد تک مجروح ہوجائے گی۔

یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ بڑے سے بڑا ادیب بھی اس طرح کا ادب بار بار یا ہمیشہ پیدا نہیں کرسکتا، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس طرح کی غیر شخصی غیرجانب داریت صرف المیہ میں نبھ سکتی ہے۔ طربیہ میں طنز کا عنصر ہوتا ہے اور طنز کی پہلی شرط فیصلہ اور جانب‌داری ہے۔ اور اگر طربیہ صرف خوش مزاجی اور شگفتہ حاضر جوابی پر ہی

منحصر ہے تو اس میں زندگی کے بنیادی مسائل سے بحث نہیں ہوسکتی - اسی وجہ سے مغربی ادب میں المیہ کو فن کی حد آخر کہا گیا ہے -

جیسا کہ ابھی میں نے کہا، اس طرح کے مکمل المیہ کی تخلیق بار بار ممکن نہیں ہوتی کیوں کہ شخصیت سے فرار تقریباً ایک فعل محال ہے - جس طرح سے کسی مسئلہ کو تولا اور سمجھا گیا ہے اس سے شاید آپ فن کار کی ترجیح اور افتاد فکر و مزاج کا پتہ نہ لگاسکیں، لیکن جس مسئلہ کو تولا اور سمجھا گیا ہے اسکے مطالعہ سے آپ شاید فن کار کی شخصیت کا سراغ پاسکیں - مثلاً ابسن نے سچائی کے مسئلہ پر بار بار کیوں سوچا ہے ؟ شیکسپیر کے یہاں فطری اور غیرفطری اعمال کا ذکر بار بار کیوں آتا ہے ؟ اور کن اعمال کو وہ غیرفطری کہتا ہے ؟ اسکے کسی عمل کو غیر فطری کہنے کا منشا کیا ہے ؟ سافکلیس نے جبروقدر کے مسائل کو کیوں اہمیت دی ہے ؟ وغیرہ - اس طرح کے سوالات پر غور و فکر آپ کو فن کار کے بارے میں کچھ بتلا سکتا ہے - پھر استعاروں اور الفاظ کا استعمال بھی شاعر کے مزاج اور سوچنے اور دیکھنے کے انداز کی تلاش میں آپ کی رہبری کر سکتا ہے - اگر شاعر کسی تاریخی واقعہ کا یا کسی ایسے واقعہ کا ذکر کر رہا ہے جس کو وہ خود تاریخی سمجھتا ہے تو اسکے بیانیہ (Narration) اور عام روایتی بیانیہ میں کتنا فرق ہے اور کہاں کہاں ہے ؟ یہ مطالعہ بھی شاید آپ کی جستجو میں مفید ثابت ہو - یا اگر کسی خاص جذبہ یا حرکت کا ذکر بار بار کیا گیا ہے تو کس پہلو اور کس انداز سے ؟ اس سوال کا جواب بھی شاعر کی چھپی ہوئی شخصیت کو پہچاننے میں کارآمد ہوسکتا ہے - لیکن جس طرح شاعر اپنی شخصیت کو پوری طرح خفی نہیں کرسکتا اسی طرح ان تمام رمز و اشارات کے باوجود اسکے مزاج فکر کی پوری طرح نشاندھی کرنا ممکن نہیں - میں اس «صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں» کے کامیاب عمل کو شاعر کے اعلیٰ کمالات میں سے ایک سمجھتا ہوں - اعلیٰ فن کار اسی غیر شخصیت کی وجہ سے خدا کی خصوصیات کا حامل ٹھہرایا جاتا ہے - جس طرح انسان و حیوان، نباتات و جمادات کو دیکھ کر ہم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ ان کو خلق کرنے والی قوت کیسی اور کیا ہوگی (اگر اس میں ایسے صفات و خواص ہیں جو انسانی صفات کے مقابل لاکر سمجھے اور سمجھائے جاسکتے ہیں) ویسے ہی شاعر خود پردۂ تخلیق کے پیچھے مخفی رہ کر خیالات و تصورات اور کردار و تصویر سے اپنی

دنیا آباد کرتا ہے - لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر کی شخصیت کی خلاقانہ، چابک دستی یا فن کارانہ مہارت کی وجہ سے فن کے پردے میں نہیں چھپ جاتی بلکہ روایت یا رسم و رواج کے بھاری دروازوں میں بند رہتی ہے - ان دونوں غیر حاضریوں میں فرق کرنا بڑا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اعلیٰ ادب اور چوتھے درجے کے ادب میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہتا - امیر مینائی کی شخصیت کی جو خبر ہم تک پہنچی ہے اس کا خیال کیجئے اور ان کے «عاشقانہ» اشعار پڑھئے - آتش کے مزاج میں غالباً سچا فقر اور اصلی صوفیت تھی، لیکن ان کے بہت سے اشعار اس درجہ مبتذل اور رکیک ہیں کہ انہیں واقعی «ناپاک دفتر» کہا جاسکتا ہے - خود میر کے یہاں اس طرح کی فضولیات کی بہتات ہے - ریاض کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہوں نے زندگی بھر شراب نہیں پی لیکن ان کی خمریات کا دور دور شہرہ ہے - ظاہر ہے کہ اس طرح کے فن میں شخصیت کی پس پردگی اور غیرحاضری کو کوئی دخل نہیں، بلکہ زمانے کے رسم و رواج یا شاعری کی روایات کا ہاتھ ہے - ہاں اگر آپ فرائڈ (Freud) کے ازحد دل دادہ ہیں تو ان اشعار کے کوئی بھی معنی نکال سکتے ہیں - (مگر اس صورت میں شخصیت پس پردہ نہیں بلکہ «تصویر کے پردے میں بھی عریاں» ہوگی -)

اقبال سے جب ایک بار ان کے قول اور عمل کے تفاوت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ شعر کہتے وقت وہ روحانی طور پر ایک بلند تر اور پاک تر دنیا میں ہوتے ہیں اور اس کے معیار و مزاج کو عملی دنیا میں قائم رکھنا ممکن نہیں - یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے، کیوں کہ شعر کی حیثیت بہر حال الہامی ہوتی ہے، لیکن اس کے علاوہ اس رائے سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ شاعر کی صحیح شخصیت کا اندازہ اس کے کلام سے ہمیشہ اور بھرپور نہیں ہوسکتا - میر و امیر و آتش و ریاض کے جن اشعار کا میں نے اوپر ذکر کیا ان کو تو ہم یوں بھی خارج از بحث کرسکتے ہیں کہ ان میں احساس کا فقدان ہے لہذا ان کو شاعری کا نام نہیں دیا جا سکتا - لیکن اور حالتوں میں بھی شاعر کی شخصیت کو اجاگر کرنے اور سمجھنے کے لئے ہمیشہ صرف اس کی شاعری کا سہارا لینا کافی نہیں ہوتا کیوں کہ اگر وہ شیکسپیر اور ابسن کے درجہ کا فن کار ہے تو اس نے اپنی اصلی صورت تو پس پردہ رکھی ہی ہوگی، لیکن دوسری حالتوں میں بھی اقبال کے قول کی رو سے شعر اور شاعر کی صورت میں بڑا فرق ہوتا ہے -

میں نے جو کچھ اب تک کہا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ غیر شخصیت کے بغیر اعلیٰ فن نہیں پیدا ہوسکتا۔ میں نے آغاز ہی اس مسئلہ سے کیا تھا کہ بے تعلقی کے بغیر بھی اچھا ادب پیدا ہوسکتا ہے۔ اب میں ایک قدم اور آگے جاکر یہ کہوں گا کہ اکثر حالات میں اگر فن‌کار اپنی شخصیت کو اپنے فن میں رچا بسا نہ دے اور اپنی شخصیت کی خوشبوے لطیف سے اس کو معطر نہ کرسکے، تو وہ اعلیٰ ادب پیدا نہیں کرسکتا۔ یعنی اگرچہ کبھی کبھی فن‌کار اپنے کردار و تخلیق میں خود اس طرح گم ہوجاتا ہے کہ وہ خود ہی ہیرو بھی ہوتا ہے ہیروین بھی اور مسخرہ بھی (اور در حقیقت ان میں سے کسی میں بھی اس کی اصل صورت نہیں جھلکتی)، مگر کبھی کبھی بلکہ زیادہ تر فن‌کار کی شخصیت ایک ہی رہتی ہے اور اس کے سارے فن پر چھائی رہتی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں شخصیت کی اس شدید عریانیت کو پنہاں کرنے کے لئے اور تجربات کو ایک نیا روپ دینے کے لئے تمثیلیت کا دور مغربی ادب میں شروع ہوا۔ لیکن اب تمثیلیت اس درجہ مستعمل ہوچکی ہے کہ وہ اکثر خود فن‌کار کی تمثیل بن‌کر رہ گئی ہے۔ ارجن ٹائنا کے مشہور افسانہ نگار بورج (Borges) کی مثال فوراً ذہن میں آتی ہے۔ لیکن تمثیلیت (Symbolism) کے علاوہ غزل کا فن بھی کچھ اس طرح کا ہے۔ اگر غزل میں شاعر خود اپنے جلوۂ صد رنگ کے ساتھ نمایاں اور ظاہر و باہر نہ ہو، تو وہ صائب کی غزل بن جاتی ہے ورنہ حافظ و سعدی و نظیری و غالب و میر کی۔

صرف یہی نہیں کہ شاعر غزل میں محض اپنی ہی بات کہتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اگر دوسروں کی بات بھی کرتا ہے تو اس طرح گویا وہ اسکی اپنی ہی ہے۔ آپ غزل کا تجزیہ کرکے دیکھئے «ہم اور میں» اور «تم اور تو» اور «وہ» کتنی بار استعمال ہوئے ہیں؟ اور حقیقتاً یہ سب ضمیر ایک ہی شخصیت کے مختلف پر تو ہیں - غالب کا محبوب میر کے محبوب سے مختلف ہے۔ غالب خود اپنے رقیب ہیں، میر کے رقیب کوئی اور یا شاید ان کا رقیب ہی کوئی نہیں، کیونکہ وہ اپنے میں اور اپنے محبوب میں اس درجہ گم ہیں کہ انہیں اور کسی کا ہوش ہی نہیں۔

سو ظلم اٹھائے تو کبھی دور سے دیکھا
ہرگز نہ ہوا یہ کہ کبھی پاس بلائے

درویش ہم ہیں آخر دویک نگہ کی فرصت
گوشے میں بیٹھے پیارے تم کو دعا کریں گے

تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا
اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلائیے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پُرخوں کی اک گلابی سے

قتل کئے پر غصہ کیا ہے لاش مری اٹھوانے دو
جان سے بھی ہم جاتے رہے ہیں تم بھی آؤ جانے دو

بلبل کو موا پایا گل پھولوں کی دکاں پر
اس مرغ کے بھی جی میں کیا شوق چمن کا تھا

اب نیک و بد پر عشق میں مجھ کو خبر نہیں
اس میں مجھے برا کہو کوئی بھلا کہو

یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

میر جو سراپا دل ہیں زمانے سے اپنا حال کہتے چلتے ہیں یا ان کی مثال کسی مجذوب کی سی ہے جو ہر شخص سے اپنی گفتگو کرتا ہے ۔ غالب جو سراپا دماغ ہیں خود سے بھی اپنا حال کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اپنے محبوب کا شکوہ بھی کرتے ہیں تو یوں گویا یہ کیفیت صرف انہیں کی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ کوئی اور اسے سن لے ۔

اگر شخصیت کی نفی شعر میں لازم ہوتی تو غزل کا وجود ہی نہ ہوتا، یا اگر غزل ہوتی ہی تو سطحی تصوف اور پیش پا افتادہ روایتی عشق کا گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ۔ سچ پوچھئے تو غزل کا شاعر شخصیت (Personality) سے بھی آگے گذر کر ذات (Person) تک پہنچ جاتا ہے ۔ اور غزل میں جتنی زیادہ ذاتیت ہوگی اتنی ہی وہ کامیاب اور موثر ہوگی ۔ اقبال کی غزلیں اور ہر لحاظ سے مکمل سہی لیکن صحیح معنوں

میں غزل کے دائرہ سے اکثر و بیشتر باھر ھیں۔ فکر جب تک تخئیل اور احساس کی تیز بھٹی میں پگھل کر جذبہ نہ بن جائے غزل میں کام نہیں آسکتی شیلی کے بارے میں جو کہا گیا کہ اس نے فکر کو جذبہ کے سانچے میں ڈھال دیا تو اسی لئے کہ اس نے اپنے شعر کی بنیاد اگرچہ فکر پر رکھی لیکن مسئلہ کو سوچنے کے بجائے اس نے اس کا اس شدت سے احساس کیا کہ وہ جذبہ بن گیا اور اس کے ماورائی استعاروں نے اسے اور بھی جلا دے دی۔ اقبال اس وجدانی کیفیت سے اکثر محروم رھے۔ جہاں جہاں تصوف کی کارفرمائی ھے یا ذاتی جذبہ بروے کار آگیا ھے مثلاً ان اشعار میں:

تھی کسی درماندہ رھرو کی صدائے دردناک
جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا میں

عشق بھی ھو حجاب میں؟ حسن بھی ھو حجاب میں؟
یا تو خود آشکار ھو، یا مجھے آشکار کر

یا شروع کی چند غزلوں میں سچی غزلیت ملتی ھے لیکن:

دریا میں موتی اے موج بے باک — ساحل کی سوغات خار و خس و خاک
کامل رھی ھے رندی کے فن میں — مستی ھے جس کی بے منت تاک

کی طرح کی شاعری اپنے لہجہ کی بلندی اور جلال کے باوجود نہ غزل بن سکی نہ نظم بلکہ ایک ناکام اور داغ دار تجربہ بن کر رہ گئی۔

پہلے کہا کرتے تھے کہ اسلوب شخصیت کا دوسرا نام ھے۔ پھر یوں بھی کہا گیا کہ موضوع شخصیت کا دوسرا نام ھے۔ دراصل یوں کہنا چاھئے کہ رجحان شخصیت کا دوسرا نام ھے۔ بہت سے ادیبوں کے طرز ایک دوسرے سے ملتے جلتے ھیں۔ بہت سے صاحب طرز ادیب صاحب طرز ھی نہ ھوتے اگر ان کے پہلے کچھ اور صاحب طرز نہ ھوتے۔ موضوع تو بہر حال تقریباً ھمیشہ ایک ھوتا ھے۔ لیکن موضوع کی طرف جھکاؤ کس درجہ کا ھے اور زاویۂ نظر کیا ھے؟ یہ ضرور فن‌کار کی انفرادی ملکیت ھوتی ھے اور اسی سے اس کی شخصیت کا کچھ صحیح پتہ چل سکتا ھے۔ میں نے ابھی رقیب کے موضوع پر غالب اور میر کے مختلف رجحانات کی طرف کچھ اشارے کئے ھیں۔ رقیب اُردو شاعری کے بنیادی موضوعات میں سے ایک ھے کیونکہ اس کا تعلق محبوب اور عشق سے بڑا گہرا ھے اس لئے ظاھر ھے کہ عشق اور محبوب کے موضوعات اردو شاعری میں

نہایت ہی بنیادی ہیں اور ان کا استعمال شعر میں تبھی ہوسکتا ہے جب شاعر کا تجربہ اس بارے میں ذاتی اور احساس گہرا ہو (خمار بارہ بنکوی کی طرح نہیں کہ «انڑمیڈیٹ میں تھا کہ ایک لطیف حادثے سے دو چار ہوگیا۔ پڑھائی ترک کردی اور شعر کہنے لگا») اور صرف احساس کی گہرائی سے بھی کام نہیں چلتا اگر اس میں اتنی شدت اور تندی (اور ساتھ ہی ساتھ وسعت) نہ ہو کہ شاعر کی پوری شخصیت کو اپنے اندر جذب کرلے:

کچھ چونک سی پڑی ہیں فضا کی اداسیاں
اس دشت بے کسی میں سر شام تم کہاں
جز ذوق طلب جز شوق سفر کچھ اور مجھے منظور نہیں
اے عشق بتا! اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں

بظاہر پہلا شعر وصال کا ہے اور دوسرا ہجر کا۔ لیکن حقیقتاً پہلا شعر ہجر کا ہوگیا ہے اور دوسرا وصال کا۔ یہ شاعر کی شخصیت کا پرتو ہے۔ نہ صرف یہ قابل غور ہے کہ فراق کے شعر میں ایک خاص ہجر کے سنجیدہ اور بوجھل لمحات کے نغمہ کا ماحول اور فضا ملتی ہے اور جگر کے شعر میں ایک مستی اور لڑکپن کے معصوم الھڑپن کی جھلک، بلکہ یہ بھی کہ محبوب کے آجانے کے باوجود دشت بے کسی کا رنگ نہیں بدلا اور فضا کی اداسیاں صرف چونک کر اور دھڑک کر رہ گئیں، اور شام کے ذکر نے تصویر کی اداسی کو اور بھی مکمل کردیا ہے، جب کہ جگر کے شعر میں ذوق طلب اور شوق سفر کا شعوری انتخاب ہے، مجبوراً نہیں۔ شاعر کو اس بات کا یقین ہے کہ منزل عشق جتنی کٹھن اور طویل ہو اتنی ہی خوش گوار ہے کیونکہ اسے زندگی کے بنیادی طور پر دل خوش کن اور قابل قبول ہونے کا یقین ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ محبوب بہرحال اسی کا ہے۔ یہ ذاتی اور منفرد رجحان دو اور اشعار میں زیادہ واضح طور پر نمایاں ہے:

نکہت زلف پریشاں داستان شام غم — صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو
ان کا تصور شب ہمہ شب — خلوت غم بھی بزم طرب

فراق نے یہ واضح نہیں کیا کہ صبح تک یہ باتیں کس سے ہوں گی۔ شاید خود اپنے ہی سے لیکن ذکر محبوب کا ہے۔ فراق کی داستان شام غم کی ہے جو زلف پریشاں

کی طرح تاریک اور برہم ہے۔ اور نکہت زلف پریشان کے ذکر میں وصال کی امید یا گذشتہ وصل کی یاد نہیں، بلکہ تمنائیت (Wishfulness) ہے۔ جگر کے یہاں تمنائیت کا دور دور تک پتہ نہیں۔ وہ ہمہ‌شب محبوب کے تصور میں کھوئے رہتے ہیں اور ان کی خلوت غم محض تکلفاً خلوت غم ہے ورنہ در اصل وہ بزم نشاط و وصل کے درجہ کی چیز ہے۔

اس طرح غزل کا شاعر اپنی شخصیت کی انفرادیت اور نگارنگی کی وجہ سے ایک ہی موضوع کو مختلف حیثیتوں اور زاویوں سے برتتا ہے۔ غزل شخصیت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس کے باوجود ہم آپ حافظ کو یہ نہ سمجھ پائے کہ وہ رند خراب تھے کہ ولی کامل اور یہ نہ طے کرپائے کہ جب انھوں نے:

من ہماں دم کہ وضو ساختم از چشمۂ عشق
چار تکبیر زدم یکسرہ بر ہر چہ کہ ہست

کہا تھا تو ان کے تصور میں کس چشمۂ عشق کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ یہ ابہام شاعری کے اٹل اور ازلی رازوں میں سے ایک ہے اور شاعری کی آدھی روح اسی سرعظیم میں مخفی ہے۔ یہ معما شاعری کی روح رواں بھی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی۔ اس کے علاوہ ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

حقیقت میں ایک بڑی غلطی ہوگی - اور عظمت جو مسلمانوں کے اس عالیشان کام کی اس وقت ہر عام و خاص کے دلوں میں ہے، وہ ان ماتحتی مدارس کے ذریعہ سے کچھ ترقی نہ کرے گی - بلکہ اوس کے برخلاف نتیجہ ظہور میں آوے گا - اور ان تمام حالات کے لحاظ سے اور یہ کہ اگر ماتحتی مدارس قائم ہوئے تو ان کے انتظام کی بھی نگرانی پوری پوری دشوار ہوگی - میرے نزدیک کمیٹی کو ابھی اس طرف متوجہ ہونا نہیں چاہیے - بلکہ میری دانست میں نہ ابھی کسی مدرسہ کے لیے کتب درسیہ کا سلسلہ تجویز کیا جاوے نہ کسی موجودہ مدرسہ کی ذمہداری یہ کمیٹی اپنے اوپر لے - ابھی صرف کمیٹی کا یہ کام رہنا چاہئے کہ جس تدبیر سے ممکن ہو روپیہ جمع کئے جاوے اور لاؤ لاؤ کے سوا کسی سے ایک بات نہ کرے - جب خدا وہ دن کردے گا کہ مدرسۃالعلوم کے قائم ہونے کے واسطے سرمایہ کافی بہم پہونچ جاوے گا تب اوس دن باقی تمام کام آسانی سے طے ہوجاویں گے - اور جو مشکلیں پیش آویں گی وہ ایسی سخت نہ ہوں گی جیسے مدرسۃ العلوم کا قائم ہونا - اور یہ تمام مشکلات یکے بعد دیگرے کمیٹی سے بڑے ولولہ اور شوق کے ساتھ جلد جلد حل ہوجاینگے - فقط والتسلیم -

خاکسار

مشتاق حسین عفی‌عنہ = از علی‌گڑھ ۷ مئی ۱۸۷۳ء

تعمیل کے وقت جو جو دقتیں اور خرابیاں پیش آویں گی وہ نہایت پیچ در پیچ ہوں گی۔ اور جس کا اس وقت پورا پورا تصور بھی مشکل ہے۔ بعض اضلاع میں ماتحتی مدارس قایم ہوجاویں گے، بعض میں نہ ہوں گے۔ پھر ابھی اسبات کا کچھ مذکور نہیں ہوا ہے کہ وہ تقسیم رسدی کس اصول پر ہوگی۔ آیا فی ضلع کے حساب سے ہوگی، یا ہر ایک ضلع سے جو سرمایہ جمع ہو اسکے لحاظ سے، یا جس قدر ماتحتی مدارس قائم ہوں گے اور ہوتے جاویں گے اون کی تعداد پر، یا کس طرح سے ہوگی۔

(۵) مدرسۃ العلوم کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں ایک خیالی تصویر کی طرح سمائی ہے اوس کا نمونہ ان ماتحتی مدارس کے ذریعہ سے دکھلانا لوگوں کے شوق اور ولولہ کی کچھ تائید نہ کرے گا۔ بلکہ میری دانست میں اور پھیکا کردیگا۔

(٦) ہماری یہ کمیٹی صرف روپیہ جمع کرنے والی کمیٹی ہے۔ اس کو اس سے کچھ تعلق نہیں ہے کہ تعلیم کا بندوبست کس طرح سے ہوگا اور طالب علموں کی حالت میں کیا کیا اصلاح مناسب ہے۔ اور جب تک کوئی ایسی کمیٹی قایم نہ ہوجسکے اختیار میں یہ سب باتیں ہوں اسوقت تک صرف ماتحتی مدارس کی نگرانی کیواسطے جو کمیٹیاں مفصلات میں قایم ہونگی ان کمیٹیوں کی نگرانی ناممکن ہے۔ وہ کمیٹیاں امور انتظامی میں کونسی کمیٹی سے خط و کتابت کریں گی۔ ہماری موجودہ کمیٹی تو ان معاملات کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھنے کا بھی منصب نہیں رکھتی۔ اور جب یہ حال ہے تو میرے نزدیک ہماری اس کمیٹی کو ایسی باتوں کے فیصلہ کا بھی شاید منصب نہیں۔

المختصر میرے نزدیک ابھی ماتحتی مدارس قائم کرنے سے لوگوں کے خیالات منتشر ہوجاویں گے۔ اور مدرسۃ العلوم کے سرمایہ کی ترقی میں بہت سے نقصان پیش آویں گے۔ اور اس بات کے بیان کرنے کی مکرر کچھ حاجت نہیں ہے کہ جب تک بظن غالب یہ نہ معلوم ہوجاوے کہ کب تک مدرسۃ العلوم جاری ہوسکے گا اس وقت تک ماتحتی مدارس میں مصروف ہونا

سال پیشتر یہ ماتحتی مدراس قائم ہوں - لیکن یہ بھی نہایت لغو بات سمجھی جاویگی کہ ماتحتی مدارس کے طالب علم اون مدراس کی تعلیم سے فارغ ہوکر مدرسۃ العلوم کے واسطے تیار ہوجاویں اور مدرسۃ العلوم اس وقت تک جاری نہ ہوسکے - میں یہ نہیں کہتا کہ مدرسۃ العلوم کے قائم ہونے کی امید نہیں ہے- مگر ہاں یہ ضرور کہہسکتا ہوں کہ اس وقت تک وہ سامان مہیا نہیں ہوا ہے جس سے یہ امید ہوسکتی ہوکہ چار پانچ برس کے بعد بھی جاری ہوسکتا ہے- اس وقت تک ہم نے صرف ۷۵۰۰۰ روپیہ کا چندہ کیا ہے- جس میں سے ایک ثلث کے قریب وصول ہوا ہے - اور ایک معقول رقم کا وصول مدرسہ کے جاری ہونے پر منحصر ہے - حالانکہ میرے خیال میں ان ماتحتی مدراس میں ایسے متوسط الاستعداد مسلمان نوجوان بھی داخل ہوجایں گے جو تین چار برس بلکہ دو تین ہی برس میں مدرسۃ العلوم میں داخل ہوجانے کے لایق سمجھے جاویں گے - پس جب تک دو ثلث سرمایہ ہی مدرسۃ العلوم کے واسطے جمع نہ ہو اس وقت تک یہ خیال کرنا کہ وہ چند برس بعد جاری ہوجاوے گا بڑی غلطی ہے -

(۲) ایک اور بڑی وجہ ابھی ماتحتی مدارس کی طرف توجہ نہ کرنیکی یہ ہے کہ خیالات جو مدرسۃ العلوم کے واسطے چندہ جمع کرنے میں مصروف ہیں وہ بغیر کسی کامل نتیجہ حاصل کرنے کے منتشر ہوکر ان ماتحتی مدارس کے چندہ جمع کرنے میں مشغول ہوجاویں گے- جس سے مدرسۃ العلوم کے واسطے ایک قسم کا سخت نقصان ہوگا -

(۳) چندہ دینے والے بھی دونوں کاموں کے واسطے چندہ دینے سے جی چورایں گے - اور بعض اضلاع کے بعض اہل ہمت باشندے اگر کچھہ صرف ہمت فرماویں بھی تو وہ آخر کار غیر کافی ثابت ہوگا -

(٤) سرمایہ مدرسۃ العلوم کی آمدنی جب ماتحتی مدارس کو تقسیم ہوئی تو گو اصل سرمایہ میں کچھہ کمی نہ ہو لیکن اس آمدنی کے ذریعہ سے جو ترقی سرمایہ میں ہوتی اسمیں نقصان ہوگا - اور رسدی طور سے تقسیم آمدنی کا انتظام بھی اس قدر دشوار بات ہے کہ گو اسوقت کہنے کے لئے آسان ہو لیکن اسکی

society. The difficulties of the Hindoos joining with the Muhammadans owing to the religious rites of the former might be touched upon in the circular.

All the matter I have referred to in this note has, I know, been most fully and ably worked out by you in your different books but I do not remember having seen it in the form of a small circular in connection with the Muhammadan College subscription list. If there is a circular of this description please let me have one or two copies of it as I fear people will not subscribe liberally if they do not know the existing wants and the proposed remedy in a short and definite form.

Hoping to hear of the success of your great undertaking.

I remain,
Yours very sincerely,
JOHN MURRAY KENNEDY

To
SYED AHMED KHAN BAHADUR, C.S.I.
Benares.

[70]

Letter from Mushtaq Husain to Syed Ahmad Khan

جناب قبلہ و کعبہ ام سلامت - جناب سکریٹری کمیٹی خزینۃ البضاعۃ سلامت -

تسلیم - بلحاظ تحریک جناب مرزا محمد رحمت اللہ بیگ صاحب صدر انجمن کمیٹی موصوفہ مندرجہ روئداد کمیٹی ۱۳ اپریل کے میں اپنی رائے ناقص خدمت عالی میں پیش کرتا ہوں - اور اول اسبات کی معزرت کرتا ہوں کہ یکم مئی سے پہلے ایک مغالطہ کی وجہ سے اپنی رائے نہ بھیج سکا - جس کا الزام بلاشبہ میرے ذمہ ہے اور اوسکی معافی چاہتا ہوں -

(رائے)

(۱) میری رائے میں ابھی ماتحتی مدارس کی نسبت اس کمیٹی کو متوجہ ہونا نہیں چاہئے - یہ سچ ہے کہ مدرسۃ العلوم کے قائم اور جاری ہونے سے چند

[69]

Letter from John Murray Kennedy to Syed Ahmad Khan

CALCUTTA
April 20, 1873

MY DEAR SIR,

I have written to England to have a draft for Rs. 1,000 (one thousand rupees) on Calcutta in your favor, sent to your address in Benares which I hope you will receive in about seven or eight weeks from the present date. It will be made payable to the "Life Honorary Secretary to the Mohammadan Anglo-Oriental College Fund Committee."

I think it would be desirable in case you want to get subscriptions in England or from people whom you have no opportunity of seeing, to state in a short circular. First that the state of education generally amongst the Muhammadans in India is very bad.

Secondly that very few avail themselves of the present system of government education and the reasons why they do not.

Thirdly that those who have availed themselves of the government course have not benefited much by it and that their social condition is not improved. Therefore, that the leading Muhammadans in India think it necessary in order to raise their co-religionists from their present state to have a system of Colleges and schools in connection with a University of their own. Residence at College for a certain period, as at Oxford and Cambridge being compulsory I would here shortly state the greater advantages that residence would have here even than in England and that it is quite indispensable to the success of the Scheme. The course of training in these schools and colleges to be framed by a Muhammadan senate with a view of meeting the special wants of the students as Muhammadans and of members of

روپیہ اوسکی قیمت سے حاصل ہو معہ کاپی ریٹ [رائٹ] کمیٹی اسلامی کے نذر کروں۔ پانچ روپیہ آمدنی چندہ معرفت سید محمود علی صاحب اسسٹنٹ سکریٹری آج خدمت عالی میں روانہ ہوں گے ۔ تفصیل بھی وہی لکھیں گے ۔ سید محمد محمود صاحب بہادر کی راے کو میں نے پڑھا اور غور کیا ۔ درحقیقت یہ طریقہ نہایت عمدہ ہے ۔ لیکن دفعہ ۱۹ کے مضمون سے مجھکو اتفاق نہیں ہے ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ تعلیم مذہبی تینوں درجوں میں لازمی ہونی چاہئے اور مدرسہ اور مدرسۃالعلوم میں تو میں اس کو بہت ہی ضروری سمجھتا ہوں ۔ اگر دارالعلوم کے واسطے لازم نہ ہو اور طالب‌علم کی راے اور اختیار پر چھوڑا جاوے تو کچھ مضائقہ نہیں ۔ کیوں کہ میری دانست میں اگر طالب علم مدرسۃالعلوم میں مذہبی تعلیم برابر پاتا رہے گا تو غالباً اوس کو دینیات میں نہایت عمدہ دستگاہ حاصل ہوجاوے گی جو لایق مسلمانوں کے واسطے بہت ضروری ہے ۔ تہذیب‌الاخلاق کی بابت ٹکٹ قیمتی ٤ روپیہ ملفوف ہیں ۔ میرے ایک دوست نواب‌علی محمد خانصاحب جو خاندان نواب جھجر سے ہیں اور جن کو شاید آپ بھی جانتے ہوں گے تہذیب‌الاخلاق کو شروع سے خریدنا چاہتے ہیں اور سنہ ھ ۹۰ کے واسطے بھی خواہش‌مند ہیں ۔ پس براہ مہربانی سوا دو برس کے پچھلے پرچہ ان کے نام پر پم‌فلٹ کرکے بھیج دیجئے اور آیندہ کے واسطے بھیجتے رہئے ۔ قیمت بعد آنے پرچوں کے بھجوا دیجاویگی ۔ حدیث شعیہ مضمون تہذیب‌الاخلاق میں چھپنے کے لائق ہے ۔ اگر آپ کی بھی راے ہو تو چھاپ دیجئے ۔ ہمارے اکثر علماء تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں یہ حدیث نہیں ہے ۔ جناب مجتہدالعصر کی طرف سے ابھی میرے عریضہ کا جواب نہیں آیا ۔ دیکھئے وہ کیا فرماتے ہیں ۔ مباحثہ میں آجانا اس کا میری دانست میں خوب ہوگا ۔ میں نے آپ کی آج بہت سامعہ خراشی کی ہے اس واسطے معافی مانگتا ہوں ۔ والتسلیم ۔

۲۱ مارچ سنہ ۱۸۷۳ء

المرقوم ۲۱ محرم‌الحرام ۔ پٹیالہ

عریضہ‌الادب

سید محمد حسن

ہوگا وہ شاید وہی طریقہ استفتا کا ہے جسکے عادی ہورہے ہیں - جو امور مصر اور قسطنطنیہ میں رائج ہیں اور مسلمانان ہند ان کو خلاف شرع جانتے ہیں ان کا استیصال اس طرح بآسانی ہوسکتا ہے کہ علماء عرب و مصر وغیرہ سے استفتا ان کے باب میں کئے جائیں اور وہ فتوے مسجل بمواہیر چھاپے جائیں - اور باہمی ردوقدح اس امر کے لئے مفید نہ ہوگی - فقط -

نیازمند ، محمد کریم بخش -

[68]

Letter from Khalifa Mohd Hasan to Syed Ahmad Khan

جناب مخدوم و معظم مکرم جناب مولانا سید احمد خانصاحب بہادر

سی - ایس - آئی زید مجدکم

تسلیم و نیاز کے بعد گذارش ہے کہ ترجمہ اقوم المسالک کو میں نے دیکھا بہت اچھا ہوا ہے اور مولوی محمد اسمعیل صاحب نے واقعی بہت محنت کی ہے - مجھکو یہ امر ملحوظ رہےگا اور میں ازعقب کچھ اس بابت میں تحریر کروں گا - منشی نولکشور صاحب کی یہ راے ہے کہ مسودہ آپ کے حضور میں صاف کیا جاوے اور آپ جہاں جہاں ضروری سمجھیں اس پر حاشیہ لکھدیں اور تقطیع وغیرہ کی بابت ہدایت فرماوین - پھر وہ بہت عمدہ خط سے اچھے عمدہ کاغذ پر چھپ جاوے تو میرے نزدیک بھی اس میں کچھ قباحت نہیں - آج میں نے اس کا پمفلٹ آپ کے نام نامی پر روانہ کردیا ہے - اور گذارش ہے کہ جب منشی نولکشور صاحب کسی شخص کاتب کو خدمت عالی میں بھیج دیویں آپ اس کا لکھنا شروع کرا دیجئے - آپ کا ذکر جمیل جو دیباچہ میں مترجم نے کیا تھا میں خیال کرتا ہوں کہ آپ نے خط نسخ اس پر کھینچ دیا ہے مگر میرے نزدیک یہ امر ضروری ہے - اور آپ کے نام نامی سے اس ترجمہ کا خالی رہنا میں پسند نہیں کرتا - پس براہ کرم اس کو ترجمہ میں رہنے دیجئے - میرا ارادہ ہے کہ جب یہ کتاب چھپ جاوے بعد وضع خرچ جو

تھا کہ ایک سب کمیٹی مفید منعقد ہوجاتی - کہ مضامین وحشت انگیز تہذیب الاخلاق چھپنے شروع ہوئے - اول اول ان لوگوں سے لڑنا پڑا اور فہمائش میں سعی کی گئی، اور اوہام ان کے رفع کئے گئے - لیکن مضامین کی تیزی نے ایسا اثر کیا کہ پھر زخموں کا اندمال دشوار ہوگیا - میری دانست میں ان مضامین کے چھاپنے کا وقت ابھی نہ آیا تھا - جلدی ہوئی اور سخت مضرت پہنچائی - اگر کمیٹی میں وہ مضامین پیش کئے جاتے اور کمیٹی صلاح چھاپنے کی دیتی تو بہتر ہوتا - میرا گمان ہے کہ کمیٹی ان مضامین کے چھپنے پر ہرگز اتفاق نہ کرتی - بہر حال تیر از کمان جستہ باز نیاید - جو کچھ ہوا سو ہوا - آیندہ ضرور ہے کہ اس میں احتیاط کی جاے - اب ان مضامین نے ایسا برا اثر پیدا کیا ہے کہ اس کا اثر مدت دراز تک باقی رہےگا - پھر اسکے رفع کرنے کے بعد دلوں میں رغبت پیدا کرنا ایک کام ہے - جو رنگ ابتدائی تدبیروں کا تھا اس سے لوگوں کو مدرسۃالعلوم کی بنا ایک خیالی وجود معلوم ہوتی تھی - اور اکثر یہ سمجھتے تھے کہ جناب کی حیات میں ظہور اس کا ناممکن ہے - اور بعد جناب کے ایسی ناامیدی تھی کہ پھر کوئی اسی مدرسہ کا قائم کرنے والا خیال میں نہ آتا تھا - یہ افسردگی بھی ایک بڑا سبب بےدلی و بے رغبتی امداد چندہ میں پیدا کرنے کا رہا - لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ عزیزالقدر سید محمود سلمہ اللہ تعالےٰ کی تجویز کے مطابق اگر بنیاد اس مدرسہ کی جلد قائم ہوگئی تو لوگوں کی ناامیدی جاتی رہےگی - اور اسکے جاری ہوجانے کے بعد مجھکو قوی امید ہے کہ آپ کی مساعی جمیلہ فراہمی چندہ و سامان کے جمع کرنے میں بہت جلد اور عمدہ اثر پیدا کریں گے -

اگر میری راے غلط نہ ہو تو میں یہ التماس کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے عقائد اور رسمیات دینی کی بابت نکتہ چینی نہ کی جائے - میں یہ نہیں کہتا کہ اسکی ضرورت نہیں ہے - ضرورت ہے لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ایسی تیز نکتہ چینی کا اثر اچھا ہو - اچھے اثر کا تو کیا ذکر ہے تدابیر مفیدہ میں مضر اور خلل انداز ہے - علاوہ اسکے یہ طرز نکتہ چینی کی بھی میری ناقص راے میں وحشت انگیز ہے - جس طریق سے مسلمانوں کو اسباب میں راہ پر لانا مناسب

پھر میں کمیٹی کو اس امر پر بھی متوجہ کرانا چاھتا ھوں کہ وہ مذھبی تعلیم میں بھی اجمال نہ رکھے جوکہ دلوں پر کھٹکتی ھے - بلکہ اوسکے تعلیم کے اصول اور کتابوں کی تفصیل اور اوسکے مدارج کو بہ اصلاح ممبران کے تجویز کرکے مشتہر کردے -

اگر کمیٹی نے ایسا کیا تو غالباً وہ کامیابی کے آثار جلد اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور اوس کا کام بخوبی چل نکلیگا - والسلام

آپ کا خادم
مہدیعلی ممبر کمیٹی
۷ مارچ سنہ ۱۸۷۳ء

[67]

Letter from Mohd Kareem Bukhsh to Syed Ahmad Khan

کونچ ضلع جالون ۹ مارچ سنہ ۱۸۷۳ء

مطاع نیازمندان جناب مولوی سید احمد خانصاحب سلامت -

نوازش نامہ پہنچا- ھنڈوی ٤ روپہ قیمت تہذیب الاخلاق ملفوف ھے- مدرسۃالعلوم کے باب میں جو ارشاد ھوا ھے میں خود اپنی ایک تنخواہ دینے کو موجود ھوں - ۱۰۰ روپیہ اسکے لئے جمع کرلیا ھے اور ۱۰۰ روپیہ فروری سنہ ٧٤ء تک اور جمع ھوجائیں گے - میرا ارادہ ھے کہ فروری سنہ ٧٤ء میں کل ۵۰۰ بھیجدوں گا - چونکہ آپ نے ھم لوگوں کو یہ سکھلادیا ھے کہ آزادانہ جو کچھ دل میں ھو کہہ ڈالیں اس واسطے اپنے خیالات پیش کرتا ھوں - امید ھے کہ جرآت آزادی کی معاف ھو - جب جناب نے اس مدررسۃالعلوم کا ذکر کرکے لوگوں کو اطلاع دی اس وقت عموماً مسلمانوں کو ایک جوش اس کی مدد کا پیدا ھوا - اگر وھی خیالات رھتے تو اب تک بہت کچھ ھوجاتا - مگر تہذیب الاخلاق کے محض مضامین نے اس تدبیر میں بڑی رخنہ اندازی کی - مجھکو چند اوگوں سے کام پڑا جو ابتدا میں نہایت شایق امداد مدرسۃالعلوم کے تھے - اور قریب

شرکت سے انکار کرنا مسلمانوں کا اگر بےیقینی کے سبب سے ھے وہ رفع ھوسکتا ھے - اور ھر شہر میں ایک سب کمیٹی قائم کرنے اور اون کی کوشش سے چندہ جاری ھوسکتا ھے - لیکن اگر شرکت سے انکار کسی وجہ سے ھے تو اوس کا تحقیق کرنا اور اس کا دور کرنا ایک ضروری کام کمیٹی کا ھے - اس لیے میں چاھتا ھوں کہ اب اگر کوئی کمیٹی منعقد ھو تو آپ میرے اس عریضہ کو پیش کرکے کمیٹی کو اون وجوہ کے دریافت کرنے پر متوجہ کیجئے - تاکہ کمیٹی اس کا علاج کرے - میں بہت سے اخبار دیکھتا ھوں جس سے عام مخالفت مسلمانوں کی اس سے ظاھر ھوتی ھے - میں اکثر باتیں سنتا ھوں جس سے اون کی نا رضامندی پائی جاتی ھے - اگر ھم نے اس پر سکوت کیا اور اوس کا جلد چارہ نہ کیا تو ھم کو اپنے ایک بڑے مقصد کے فوت ھونے پر یقین کرلینا چاھیئے -

میری ناقص رائے میں ضروری ھے کہ کمیٹی ان وجوہ کو تحقیق کرے - اور بعد اتفاق رائے کے ان غلطیوں کو جو مسلمانوں کے خیالات میں پیدا ھوگئی ھیں ظاھر کرکے مشتہر کرے - اور اس مدرسہ کے اصول سے صاف صاف عام مسلمانوں کو آگاہ کرے -

میرے نزدیک مسلمان اب تک اسے شخصی مدرسہ جانتے ھیں - اور صرف آپ کی رائے کو اس دائرہ کا پرکار سمجھے ھیں - اور اس لئے بہت سے وہ مذھبی خیالات اور مذھبی رسومات کی تبدیلی سے ڈرتے ھیں - اس لئے میرے نزدیک ضروری ھے کہ جس طرح اصول تعلیم کی کمیٹی نے تجویز کرکے مشتہر کردی ھے اِسی طرح قاعدے مذھبیت اور معاشرہ کی جس کی پابندی طلبہ کو کرنی ھوگی بعد صلاح سب ممبران کے مقرر کر کے مشتہر کردے -

اگر آپ نے ایسا کیا اور غلبہ رائے مسلمانان سے اس کا توجہ ھوگیا - تو لوگوں کو اطمینان ھوگا - ان کے دھڑ کے نکل جاوینگے - ان کی طبیعتوں کا انتشار جاتا رھے گا - بغیر ایسے اطمینان پیدا کرانیکے اور قواعد ترتیب مدرسہ کے صاف صاف ظاھر کردینے کے مسلمانوں سے امید شرکت کی رکھنا ایک غلط خیال ھے -

[65]

Letter from Moulvi Mohd. Samiullah to Syed Ahmed Khan

بعالی خدمت جناب مولوی سید احمد خانصاحب سکریٹری کمیٹی
خزنیتہ البضاعت دام مجدکم

بعد تسلیمات کے گذارش کرتا ہوں میری رائے میں دفعہ (۲۰) قواعد کمیٹی میں دیہات زمینداری مالگذاری کے خریداری کی اجازت دینی قرین مصلحت ہے - اور نیز نسبت تبدیلی نام کے اگر کمیٹی کے نام میں لفظ کمیٹی دارالعلوم داخل کیا جاوے تو اس میں بھی کوئی امر نامناسب نہیں ہے اور اس میری رائے سے منشی محمد ذکاالله صاحب کو بھی اتفاق ہے -

ذکاء الله

عریضہ خاکسار
محمد سمیع الله ممبر کمیٹی خزنیتہ البضاعت

[66]

Letter from Moulvi Mehdi Ali to Syed Ahmad Khan

بخدمت صاحب سکریٹری مجلس خزنیتہ البضاعت مدرسة العلوم للمسلمین

صاحب من — میں خیریت سے - کچھ خبر چندہ مدرسہ کی نہیں سنتا اور نہ کسی اخبار میں نہ کسی پرچہ میں تہذیب الاخلاق کے فہرست چندہ دھندگان کی دیکھتا ہوں - یا تو چندہ کی فہرست بند ہے یا چھاپی نہیں گئی -

اگر چندہ بند ہوگیا تو یقین کرنا چاہئے کہ مسلمان رنجیدہ ہوگئے اور انھوں نے شرکت ناپسند کی - اور غالباً ایسا ہی ہوا -

مدرسة العلوم اسلامی مدرسہ ہے - اس کا کوئی کام بےاعانت کل قوم کے نہیں چل سکتا - پس تاوقتیکہ قلم و قوم خصوصاً زر و درہم سے مسلمان مدد نہ کرینگے ساری تجویزیں عبث - تمام تدبیریں مغائرہ ہیں -

امر اول غور طلب ھے - اس لئے کہ زمینداری دیہات مسلم کا یکجا ملنا مشکل اور اندیشہ قحط وغیرہ سے نیلام یا نقصان متصور ـ اور انتظام کا خرچہ زیادہ اور نگرانی اوسکی دشوار - اس لئے میرے نزدیک مناسب نہیں ھے -

امر دوم مناسب اور پسند ھے -

باقی امور کی نسبت بھی رائے لکھوں گا -

غلام آپ کا

مہدی علی

[64]

Letter from Zakaullah to Syed Ahmad Khan

جناب مخدوم مکرم مولوی سید احمد خانصاحب سکریٹری محمڈن یونیورسٹی سلامت

بعد تسلیم التماس یہ ھے کہ میں آپ کو اور جو آپ کے قائم مقام ھوں ان کو بہت خوشی سے اس امر کی اجازت دیتا ھوں کہ اپنی ساری زندگی میں جو کتابیں ترجمہ اور تالیف کروں ان میں سے جس کتاب کو چاھیں محمڈن یونیورسٹی کے خاص مدارس اور طلباء کے قاعدہ کے لئے متطبع کرلیں - اگرچہ مجھے اس کا یقین ھے کہ میری کتابوں سے بہت اچھی کتابیں عنقریب تالیف ھوجائیں گی اور اس سبب سے ان کی ضرورت کچھ نہیں رھے گی - فقط

۲۶ فروری سنہ ۱۸۷۳ء

ذکاالله پروفیسر ورناکیولر سائنس اینڈ لٹریچر

میور کالج الہ آباد

[63]

Letter from Syed Ahmad Khan to Moulvi Syed Mahdi Ali

بعالی خدمت جناب مولوی سید مہدی علی صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر سلامت

ممبر کمیٹی خزنیتہ البضاعتہ لتاسیس مدرسۃالعلوم المسلمین

بعد تسلیم عرض یہ ہے کہ دوسری فروری کو جو اجلاس کمیٹی کا ہوا اس کی روئداد پرچہ تہذیب الاخلاق میں چھپی ہے وہ پرچہ بجنسہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا ہے تا کہ اس اجلاس کی کارروائی کو آپ ملاحظہ فرماویں ۔

جو تجویز طریقہ تعلیم اوس میں پیش ہوئی ہے امید کہ اوس کو بھی آپ ملاحظہ فرماویں اور بروقت فرصت جو کچھ آپ کو اوس کی نسبت لکھنا ہو ارقام فرماویں ۔ اِلا مفصلہ ذیل امور کی نسبت جس قدر جلد ممکن ہو اپنی رائے سے کمیٹی کو آگاہی بخشیں ۔

اول یہ کہ آپ کی رائے میں واسطے آمدنی مدرسہ کے دیہات مالگزاری زمینداری کا خریدنا اور دفعہ بستم قواعد کمیٹی میں اس قسم کے دیہات کی خریداری کی اجازت دینا مناسب ہے یا نہیں ۔

دوسرے یہ کہ بموجب اون وجوہات کے جو روئداد میں مندرج ہیں آپ کی رائے میں مناسب ہیں یا نہیں کہ کمیٹی کے نام میں لفظ کمیٹی دارالعلوم داخل کیا جاوے ۔

امید کہ ان دونوں باتوں کا جواب جس قدر جلد ممکن ہو مرحمت فرمایا جاوے ۔ والتسلیم

آپ کا تابعدار

سید احمد

سکریٹری کمیٹی خزنیۃ البضاعتہ

مقام بنارس ۲۱ فروری سنہ ۱۸۷۳ء

Under the superintendence of the Senior Fellow, the Fellows of the University will write Annual Reports to this Committee, and receive their sanction as to the expenditure for the succeeding year.

Any person desirous of joining the University, without an intention to pursue exactly the fixed course, but only for the study of some special subject, may, on receiving the especial permission of the College authorities, enter the University; but he will be barred from obtaining any pecuniary rewards offered by the University. He will however have to reside within the precincts of the University and under its discipline.

*The College authorities will also have power to allow persons desirous of attending lectures only upon some especial subjects, to do so on payment of fees. But such persons will not be considered students of the University, nor will they be required to reside within its precincts or under its discipline.

The College should be situate, as has been decided by this Committee, at Allygurh. But the School Department of the University will comprise schools, similar to the one above-mentioned, situate in other towns wherever it will be possible to establish a school for preparing students for the College Department of the University.

S. M. M.

*This rule gives an opportunity to the Hindoos of availing themselves of the University Lectures

A Fellowship will be tenable for seven years, and a Scholarship only for one year. But at the end of every year, a scholar who has done well in his Annual Examination will be elected to another scholarship of an equal or higher value.

A Fellow should not be elected again at the end of the seven years of his fellowship, unless for some extraordinarily especial reason.

If a Fellow is appointed to a Lecturership in the College, he will cease to receive his yearly allowance from the Fellowship Fund, but will continue to be an Honorary Fellow of the University with the rest of the privileges of a Fellowship, as long as he remains a Lecturer in the University. There will be as many Lecturerships in the College as may be necessary for instruction in the different branches of knowledge above-mentioned. The allowance to each Lecturer will vary in amount, and the office will be tenable for life unless there is any special reason against such a course. In case of infirmity either on account of age or any accident which unfits the Lecturer for the performance of his duties, the University may give a pension and appoint a new Lecturer instead. A retired Lecturer who also held an Honarary Fellowship, will continue to hold it for life.

The Fellows will form the governing body of the University. They will meet at least once a Term in the Combination Room to decide points concerning the management of the University. The Senior Fellow will be considered as the President of the Meeting, and will have the casting vote. He will also be considered as the Head of the College.

Whenever the Fellows meet for deciding any point concerning education, the Lecturers who at the same time are not Honorary Fellows, will also have a right to appear in the Combination Room, and give votes like the Fellows of the University.

examination. The marks thus gained by each Candidate, added to the marks which he obtained in his examination for Honours, will decide his election to a Fellowship.

There may be 30 Fellowships, each of the value of Rs. 600 a year. A Fellow of the University will receive board and rooms in College free.

Every Fellow of the University will be required to reside within the precincts of the University or in the University Town. But this obligation may be dispensed with in the case of those who leave the University Town with the express intention of prosecuting study in any other place of education.

A Fellow will also have to make a promise, not to receive any pecuniary compensation for teaching privately any student who belongs to the College.

Of the 30 Fellowships the number allotted for each subject will be as follows :—

Languages, ...	8
Mathematics, ...	5
Logic, Rhetoric and Philosophy,	4
Political Economy, Political Philosophy and science of History,	4
Natural Sciences,	4
Mohamedan Law and Jurisprudence,	5

Besides these Fellowships, there may be sixty scholarships varying from Rs. 120 to 300 a year.

The annual amount of money spent in Fellowships and Scholarships will be as follows :—

30 Fellowships at	Rs.	600	= Rs.	18,000
20 Scholarships	,,	120	= ,,	2,400
20 ,,	,,	180	= ,,	3,600
14 ,,	,,	240	= ,,	3,360
6 ,,	,,	300	= ,,	1,800
		Total	,,	29,160

4. Sanskrit with Prakrit and Pali, and Philology.
5. Greek and Latin with Philology.

II. MORAL SCIENCE. i. e. one of the following :—

1. Logic, Rhetoric, Mental and Moral Philosophy.
2. Political Economy, Political Philosophy and Science of History.

III. NATURAL PHILOSOPHY. i. e. one of the following:—

1. Mathematics (Pure and Mixed.)
2. Natural Sciences.

IV. MAHOMEDAN LAW, JURISPRUDENCE AND THEOLOGY.

The application for permission to appear in the Honour Examination, must be accompanied by a Dissertation on some important point of the subject in which the Candidate wishes to take Honours. The permission to appear in the Examination will depend on the approval of the Dissertation. The Candidate will have to aver by a written statement that he wrote the Dissertation without any one's assistance. This Examination will correspond to the M. A. Examination of other Universities.

Towards the end of the Term succeeding the one in which the Honour Examination is held, successful Candidates may compete in an examination held for awarding Fellowships. Each Candidate will be examined in his own particular branch of knowledge. The Examination for Fellowships may consist only of writing Essays in the Hall of the College. The examination may last three days. On each day the Candidate will be required to write an Essay on one of a number of subjects given by the Examiner. Six hours may be allowed for each Essay.

After the result of this examination is known, the Examiners will submit to the authorities of the College the number of marks which each Candidate has obtained in the

which have engaged their attention during the Term. These examinations will be tests of their diligence, and if the result of the examination of a student holding a scholarship, is very unsatisfactory, the College authorities will have power to withdraw the scholarship from such student.

Besides these examinations, there will also be Annual Examinations, and Prizes and Scholarships will be awarded to deserving students.

At the end of the above-mentioned four years course, an examination will be held, which will correspond to the B. A. Examination in other Universities. It will be indispensable to pass this Examination before a student can be admitted in the Upper Department of the College.

After passing this Examination, the student will have a right to enter the Upper Department of the College, and prosecute his studies in one particular branch of knowledge, in order to take Honours. The course for the Honour Examination will extend over two years, but a student may, at his choice, be a candidate for Honours after the expiration of only one Academical year, if he thinks himself prepared for the Examination. If a student failing to take Honours in his first chance, appears again and succeeds in taking Honours, his name will not stand in the list of successful candidates in order of merit, but at the bottom of the list separate from the names of other successful students.

The student may choose one of the following branches of knowledge :—

I. LANGUAGE. i. e. one of the following :—

1. Arabic with Hebrew and Syriac and Comparative Philology of the Semetic Languages.
2. English with Anglo-Saxon and Comparative Philology of the Teutonic Stock of languages.
3. Sanskrit with Zend, Persian, and Philology.

Polarized Light, with the description of simple experimental modes of producing it.

ASTRONOMY.

Systems of Great Circles to which the position of Heavenly Bodies are referred. Principal phenomena depending on the Motion of the Earth round the Sun, and its Rotatory Motion round its own axis.

General description of the Solar System.

General Explanation of Lunar and Solar Eclipses.

III. LOGIC AND RHETORIC.

IV. MENTAL AND MORAL PHILOSOPHY.

V. POLITICAL ECONOMY.

VI. GENERAL HISTORY (Ancient and Modern.)

VII. NATURAL SCIENCE. i. e. Chemistry and one of the following :—

1. Animal Physiology.
2. Geology and Mineralogy.
3. Botany.
4. Zoology.

VIII. MAHOMMEDAN THEOLOGY. (Voluntary).

The above-mentioned course will occupy the first four years of the student in the College Department. Out of the three daily Lectures, one is to be devoted to Languages, one to Mathematics, and one to the secondary subjects mentioned above.

The Secondary subjects may be taken in this order :—

1st year General History (Ancient and Modern).

2nd ,, Logic, Rhetoric, and Political Economy.

3rd ,, Mental and Moral Philosophy.

4th ,, Natural Science.

The Educational year will be divided into two Terms, each equal to four months and a half. About the end of each Team the students will be examined in the subjects

Motion of Projectiles, and the simpler cases of motion round centres of force.

HYDROSTATICS, HYDRAULICS, AND PNEUMATICS.

Elementary Propositions respecting the nature; transmission and intensity of Fluid Pressures and the Conditions of Equilibrium of floating bodies.

Nature and simple properties of Elastic Fluids; and the Pressures produced by them.

Specific Gravity and modes of Determining it.

The common Pump and Forcing Pump.

The Hydrostatic Press.

The Barometer.

The air-Pump

The Steam-Engine.

OPTICS. (Geometrical).

Law of Reflexion and Refraction;

Reflexion at plane mirrors, Reflection at spherical mirrors, and Refraction through lenses, the incident pencils being direct.

Separation of Solar light into rays of different colours; Description of the Solar Spectrum. Description of the Eye; Simple Optical Instruments; Camera-Obscura; Reflecting and Refracting Telescopes.

ACOUSTICS.

Nature of Sounds; mode of Propagations;

Musical Tones, and simple propositions respecting them.

OPTICS (Physical)

Fundamental Hypothesis of the Undulatory theory respecting the Origin and Propagation of light.

General explanation of Interferences; formation of Newton's Rings with the description of simple experiments which elucidate the effects of Interference.

The course of study for the Lower Department of the College will comprise the following subjects :—

1. Any two of the following languages :—

1	Aabic, [language and litterature]		
2	English	Do	Do
3	Sanskrit	Do	Do
4	Latin	Do	Do
5	Greek	Do	Do

II *MATHEMATICS :—i. e.

Algebra

Theory of Equations

Plane Trigonometry

Spherical Trigonometry

Conics.

Solid Geometry

Differential Calculus

Integral Calculus

STATICS :

Elementary Statics, including the Resolution of Forces, the Mechanical Powers, the Centre of Gravity, and simple cases of Equilibrium of bodies or systems of bodies under the action of Gravity.

DYNAMICS.

Elementary Dynamics, including the Laws of Motion, and propositions required for determining the Rectilinear Motion of a body whether free or along inclined planes.

* This course is required for the B.A. Examination of the London University.

The examination held at the end of the five years' course at the School, will also serve to be the test for admitting boys to the College Department of the University. No student should be admitted to the College Department who fails to show sufficient proficiency in the subjects of Examination, or who has passed his 18th birth-day.

In the School there will be an hour every day during the five years, for religious intructions in simple and necessary points of Mahomedan Theology. No controversial point of Theology should be included in the course, and strict regard should be paid to choosing books, which contain doctrines received in general by the Musalmans of India.

Boys of the Imamea persuation will have to receive religious instruction from a teacher of their own persuation.

A boy entering the College Department of the University is expected to be acquainted with the general principles and doctrines of the Mahomedan religion to make it unnecessary for the University to enforce any further compulsory religious instruction. Of course every student will have a perfect right to study the Theology of his religion in particular, as will hereafter be detailed.

II. THE COLLEGE

The College may be divided into two Departments :—

1. The Lower.
2. The Upper.

The object of the Lower department is to afford instruction in the general branches of knowledge necessary for a liberal education.

The Upper Department is meant to afford sound and deep education in one Special branch of knowledge, at the choice of the student.

The course of the Lower Department will extend over 4 years. There may be not more than three hours' Lectures every day.

		Rs.
4.	Teacher of Mathematics	... 30
5.	,, ,, Persian	... 20
6.	,, ,, History & Geography	... 20
7.	,, ,, Hand writing (Persian,)	.. 20
8.	,, ,, ,, ,, (English,)	... 20
	Total	.. 430

At the end of every year the University may appoint a Committee to examine the boys, and award Prizes and Scholarships to deserving students. There may be twenty Scholarships, each tenable for one year. At the end of the year, the student may be appointed a Scholar again, if the result of his examination deserves such a favour. The Scholarships may be:-

10 of Rs. 5	monthly,	Rs. 50
6 ,, ,, 7	,, ...	Rs. 42
4 ,, ,, 10	,,	Rs. 40
	Total	Rs. 132

The amount of prizes will depend upon the funds of the school and the income arising from the tuition fees of the boys.

It is to be hoped, that benevolent persons may endow the school with money whose interest may be spent in awarding Prizes for merit in some especial subjects of study.

The Head Master will have power to hold any examinations before the Annual Examination above-mentioned. But these examinations will be no test to the University nor any Prizes or Scholarships will be awarded for merit. But if the result of a Scholar's examination is very unsatisfactory the Head Master will have power to report accordingly to the University for withdrawal of the Scholarship from such student.

The education given by these schools will be of an elementary nature, and the admission of the boys will be left entirely to the judgment of the Head of the School.

The Head Master of the school may be a Fellow of the University.

The average age of a student entering the School may be not more than 10 years if he joins the lowest Form. But in exceptional cases the Headmaster will have power to admit boys above that age, after recording the especial reasons which induce him to make such an exception.

The School course is to extend over 5 years and will include:—

1. Persian— Language, Literature and Composition.
2. Arithmetic.
3. Algebra (Elementary).
4. Elements of Euclid.
5. History of India.
6. Geography (General).
7. English (Elementary).
8. Religious Instruction.
9. Arabic (Voluntary).

There may be not more than five hours' attendance at the School.

Boarding students will have to observe the discipline which the Headmaster may think proper for the management of the school.

The Staff of Teachers may consist of :-

		Rs.
1. The Headmaster who will receive (besides his fellowship allowance,	Monthly Salary of	...200
2. Teacher of English		... 60
3. Teacher of Arabic and Mahomedan Theology,	Two	... 60

If the Committee will consent to adopt the above-mentioned primary considerations, I have to submit to their notice the following scheme of the course of study to be pursued at the proposed University :—

The University should be divided into two departments :—

I. THE SCHOOL

II. THE COLLEGE

I. THE SCHOOL

The object of the School Department is to secure for the college, a certain number of undergraduates properly prepared to go through the course of the University, and also to give facilities to boys, too young to reside within the precincts of the school, whose parents, residing in the University Town or, where the University has established a school, should intend to send them afterwards to the College. These schools should be considered no more than a preparatory step for those who ultimately intend to join the University. In fact this Department will have no connection with the University beyond mere supervision and management.

The buildings for these schools should be erected from the funds raised by this Committee. And the buildings will consist of lecture rooms and a boarding-house to hold a suitable number of boys.

The expenses of the establishments are to be paid partly from the University chest, and partly from the tuition fees. The expenses of the boarding-house should be paid by the boarders themselves. The University might only undertake to keep the school and boarding-house buildings in proper repairs.

Residence in the boarding-house be quite optional since residence at the University will count only from the date of Matriculation.

as a failure too. But if the University succeeds in producing a class of young Musalmans, having enlightened and progressive ideas, I have no doubt, the result will be of unbounded benefit. Wherever a student of our University will go, there will also go with him the notions which it is the object of our endeavours to spread, and the Musalman community will every day become more alive to their present condition, and more zealous to further the cause of enlightened education. Mere practical education is really no enlightened education, and if the University does not afford sound and deep knowledge, it can hardly be supposed to be worthy of any great consideration.

Respecting the fourth and fifth points, I have only to say that pecuniary rewards are a great encouragement to study, even in the most civilized countries of Europe, and in India, where wealth and intellectual exertion seldom go together, they are more than encouragement. It often happens that those wish to learn most have least to maintain themselves, and in such cases pecuniary emoluments cannot fail to produce good scholars.

The sixth point is of the most vital importance. It is to be the chief distinctive feature between our own Institution and the Universities which already exist in India. The mode of life amongst the Musalmans of India requires far greater reform than even their mode of education. And unless we bring a large number of students and able teachers together in one place, and form a society of their own, whose notions and objects should be different from the present society of Indian Musalmans, no educational project can be carried out to any considerable extent. The Government Educational Institutions have lost a great deal of their utility on account of the difficulty of introducing any change in the life of their students, and our University can do no better if residence of students within the precincts of the University and under its discipline, is not enforced.

English Government as a matter of course will patronize such an Institution, and if any direct pecuniary aid is given to us we should not be unwilling to put our University under the Government supervision, provided no interference is made in the management of the Institution. Under the liberal patronage of the Government, we can carry out our plans with far greater facility and success than the Government, under the existing circumstances, can possibly do. I, therefore, hope that the Committee will not refuse to concede this point which I consider to be of the greatest significance.

The second consideration hardly needs any elucidation. It is evident that no great project can be undertaken without first securing the means for its accomplishment. Colleges supported by mere annual or monthly subscriptions, have invariably failed in India, and it would simply be absurd to establish a University without a certainty of its continuance and prosperity hereafter.

But the third point, I am afraid, will call forth some opposition from you. You will perhaps say that the wants of our community in India are chiefly of a practical nature, and it is useless to attempt to give what is not urgently needed at present. For my own part, I certainly think that our wants at present are more of a theoretical than of a practical nature. Any education must be unsound which does not enlighten the mind, and if we content ourselves with mere practical education, our best students will be of no greater use to the community than those who never go through the course of our University. I consider that, by far the greatest benefit, which ought to accrue from our University, is to change the mode of thought of our students, and thus to produce men who may afterwards prove as so many instruments in the hands of the University, for spreading enlightened notions amongst the people at large. If we fail in gaining this object, we must really consider the University

5thly. That at the end of a successful course of study, emoluments should be offered to successful students without any special duties attached to them,

6thly. That residence within the precincts of the University and under its discipline should be as indispensable as education in the course of study itself.

The above-mentioned six conditions I consider to be of the greatest importance to any Educational Institution particularly to a University in India. I am so convinced of this, that I can without hesitation say, that unless these are adopted any attempt toward real education and enlightenment of my countrymen must be a failure.

With regard to the first condition, I have to state, that unless a sum, large enough to afford a revenue sufficient to cover the necessary expenditure of the University is raised, the thought of founding any thing like the Institution now proposed by the Committee should be at once discharged from the mind, As long as we depend upon Government for wants which are essentially of a domestic nature, as education necessarily is, we really expect to get what is simply impossible to obtain. The best Educational Institutions in Europe are either entirely or next to entirely free from any control of the Government of the country, and this, in countries where the rulers belong to the nation whose education is to be conducted. With how much greater force does this argument hold good in the case of India where the Government is almost wholly composed of persons belonging to a nation, totally different from us in language, in religion, and in mode of thought. By saying so, I simply mean to support my argument that it is next to impossible for the British Covernment in India to understand fully our wants with respect to education, or to superintend it in any perfect manner. The utmost that we can expect from an enlightened Government is to receive — what we in fact do receive from our Government — encouragement and patronage. If our University is intended to give sound education, the

Proposed Scheme of Syed Mohd. Mahmood

A SCHEME

FOR THE PROPOSED

MOHAMMEDAN ANGLO-ORIENTAL COLLEGE.

By

SYED MOHD. MAHMOOD, ESQUIRE

Member of the Mohammedan Anglo-Oriental College Fund Committee.

Before offering any remarks upon the scheme to be adopted at the proposed Institution, I may be allowed to bring to the notice of the Committee, a word which appears to me to have been used by mistake. This Committee calls itself "The Mohammedan Anglo-Oriental College Fund Committee". I think what we mean to found is not a College, but a University, and I hope the members will consent to my proposal that instead of the word College the word University may be substituted.

I beg to lay before the Committee the following remarks, on the management and the course of study, to be adopted at the proposed University :—

1stly. I have to mention first of all that the management of this Institution should be perfectly free from any control of the Government, beyond mere supervision.

2ndly. That the University should secure for itself sufficient annual income to keep it independent of any external aid.

3rdly. That subjects which are not exactly of any practical importance, but which improve the mind, should also be taught.

4thly. That success in the course of study, appointed by the University, should bring with it pecuniary advantages to the students.

پر منقسم کردیا ہے - ایک صیغہ اسکول کا ہے جس کا نام مدرسہ رکھا ہے - دوسرا صیغہ کالج کا ہے جس کا نام مدرستہ العلوم رکھا ہے - اور یہ دونوں صیغے علحیدہ علحیدہ قائم کئے ہیں - اور قبل قائم ہونے مدرستہ العلوم کے اور مدرسوں کا جو اس کے تحت میں ہوں گے قائم ہونا ممکن ہے - پس اگر ممبران کمیٹی اس تجویز کو پسند کریں تو میں یہ بھی تحریک کرتا ہوں کہ بہت جلد مدرسہ مقام مجوزہ میں قائم کیا جاوے - اور جب کہ روپیہ کافی جمع ہوجائے گا اس وقت مدرستہ العلوم بھی قائم ہوجائے گا -

میری تجویز میں جو میں نے پیش کی ہے اس میں میں نے یہ بھی خواہش کی ہے کہ اوس مدرسہ کی کمیٹی کا نام بجائے کمیٹی مدرستہ العلوم کے کمیٹی دارالعلوم رکھا جاوے - اور میں تحریک کرتا ہوں کہ اس تھوڑی سی تبدیلی نام کے لیے بھی اور ممبروں سے رائے طلب کی جائے -

بعد اس کے سید محمود صاحب نے اپنی تجویز پیش کی جو روداد کے آخر میں مندرج ہے - اوس کے سننے کے بعد ممبران موجودہ نے اوس کو پسند کیا - اور صدر انجمن نے اس بات کی تحریک کی کہ امور مذکورہ بالا کی نسبت ممبران سے رائے طلب ہو اور یہ تجویز چھاپا ہوکر جملہ ممبران کے پاس اور نیز جن اخبار نویسوں کے پاس مناسب ہو اون کے پاس بھیجی جائے - اور جو کہ گورنمنٹ شمالی مغربی اضلاع اور نیز گورنمنٹ ہندوستان نے بذریعہ اپنی چٹھیات کے اس مدرسہ کے لیے گرنیٹ ان ایڈ مرحمت کرنے کا وعدہ کیا ہے اس لیے چند کاپیاں اون دونوں گورنمنٹوں میں بھیجی جائیں اس امید سے کہ گونمنٹ بھی یہ تجویز پسند فرمائے گی اور اگر اس تدبیر کے موافق کالج یا اسکول قایم ہو تو اوس کو گرنیٹ ان ایڈ سے مدد دینی ہوگی -

مولوی محمد عارف صاحب نے اس تحریک کی تائید کی اور بالاتفاق منظور ہوئی فقط - بعد اس کے شکریہ صدر انجمن کا ادا کیا گیا - مجلس برخواست ہوئی فقـــط -

سید احمد - سکریٹری مجلس خزنیتہ البضاعت

سے صرف گورنمنٹ پرامیسری نوٹ یا روزینہ ہائے دوامی جن کا ذکر ۲۳ اگست ۱۸۷۱ء میں ہے یا بنک آف بنگال کے حصہ یا آراضی معافی دوامی کے خریدنے کی اجازت ہے۔ مگر سوائے پرامیسری نوٹ کی جس کو ہم خود اس وجہ سے کہ اوس سے منافع بہت قلیل حاصل ہوتا ہے خریدنا نہیں چاہتے اور کسی قسم کی جایداد اقسام مذکورہ بالا میں سے دستیاب نہیں ہوتی یا قدرے قلیل بہت گران قیمت پر ملتی ہے -

تمام تجربہ‌کار آدمیوں کی یہ رائے ہے کہ دیہات زمینداری مالگذاری کے خریدنے میں بھی کچھ نقصان و ہرج متصور نہیں ہے - پس میں تحریک کرتا ہوں کہ دفعہ مذکورہ ترمیم ہو اور دیہات زمنیداری مالگذاری کے خریدنے کی بھی اجازت دی جاوے۔

مولوی اشرف حسین خان صاحب نے اس تحریک کی تائید کی اور بالاتفاق یہ رائے قرار پائی کہ واسطے ترمیم دفعہ مذکورہ کے جملہ ممبران کمیٹی سے حسب منشاء دفعہ ۲۰ قواعد کمیٹی کے رائے طلب کی جاوے -

سید محمد محمود صاحب نے کمیٹی سے مخاطب ہوکر یہ کہا کہ

جب میں ولایت میں تھا اور اس کمیٹی کے اس ارادہ کا حال سنا کہ بعد تحقیقات اسباب مواقع ترقی تعلیم مسلمانان یہ ٹھہرا ہے کہ مدرسہ خاص مسلمانون کے لیے بنایا جاوے جس میں تعلیم مسلمانوں‌کے حال کے مناسب ہو اور نیز اس بات کی اطلاع پاکر کہ کمیٹی نے مجکو حقوق ممبری سے مشرف کیا ہے میں نے اس بات پر توجہ کی کہ ولایت کے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں‌کے انتظام اور طریقہ تعلیم کو دیکھوں اور ایک تدبیر جو کہ میری رائے میں ہماری قوم کے حالات کے مناسب ہو بصلاح و مشورہ ولایت کے نامی و قابل احباب کے اس مدرستہ العلوم کے لئے طیار کرکے کمیٹی میں پیش‌کروں - چنانچہ وہ تجویز میں نے مرتب کی ہے اور کمیٹی‌کے سامنے اس امید سے پیش کرتا ہوں کہ اگر اور ممبر بھی اس کو پسند کریں تو اس تجویز کے موافق عمل کیا جاوے - اس تجویز میں میں نے مدرسوں کو دو حصوں

٤١ــ مولوی سید فرید الدین احمد صاحب ۔
٤٢ــ منشی محمد اکرام صاحب ۔
٤٣ــ مولوی نجم الدین صاحب ۔
٤٤ــ شیخ محمد جان صاحب ۔
٤٥ــ نواب محمد فیض علی خان بہادر سی ایس ۔ آئی ۔
٤٦ــ منشی محمد صدیق صاحب ۔
٤٧ــ جناب مولوی محمد عثمان خان بہادر نے اگرچہ کوئی صاف رائے نہیں دی مگر علی گڑھ کے پسندیدہ ہونے کو تسلیم کیا ہے ۔

ممبران مفصلہ ذیل نے اختلاف رائے کیا

١ــ مولوی محمد حیدر حسین صاحب نے . . . . . الہ آباد تجویز کیا ۔
٢ــ میر سید ظہور حسین صاحب نے . . . . . مراداباد تجویز کیا ۔

مفصلہ ذیل ممبران کے پاس سے جواب نہیں آیا ۔

١ــ محمد عبدالشکور خان صاحب ۔
٢ــ مولوی عبدالاحد صاحب ۔
٣ــ منشی محمد الہی بخش صاحب ۔

صدر انجمن نے فرمایا کہ ہر گاہ باون ممبران [میں] سے سینتالیس ممبروں نے علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قایم ہونے پر اتفاق رائے کیا تو اب اس بات کا تصفیہ قطعی ہوگیا کہ علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قایم ہوگا ۔ اور اس بات کی تحریک کی کہ سکریٹری کو اجازت دی جاوے کہ علی گڑھ میں خواہ اوس کے قرب و جوار کے اضلاع میں مدرستہ العلوم کے لئے جایداد خرید کریں ۔

مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب نے اس تحریک کی تائید کی اور بالاتفاق منظور ہوئی ۔ بعد اس کے سکریٹری نے کہا کہ دفعہ ٢٠ قواعد کمیٹی میں زر چندہ

سکریٹری

سید احمد خاں بہادر سی ۔ ایس ۔ آئی ۔

اجلاس شروع ہوا ۔ اور روئداد اجلاس منعقدہ آٹھویں نومبر ۱۸۷۳ ء نمبر ۹ جو بدستخط سکریٹری مرتب اور کتاب روئداد میں مندرج تھی ملاحظہ ہوئی ۔

جو رائے کہ نسبت مقام مدرستہ العلوم کے ممبران سے طلب ہوئی تھی اس کے کاغذات پیش ہوئے جن کی کیفیت حسب تفصیل ذیل ہے ۔

پچیس ممبروں نے اس سے پہلے اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ مدرستہ العلوم علی گڑھ میں قائم کیا جاوے ۔ اون کے علاوہ مفصلہ ذیل ممبروں نے بھی اسی جگہ کو پسند کیا ہے :-

۲۶ــ مولوی اشرف حسین خان صاحب ۔
۲۷ــ سید میر بادشاہ صاحب ۔
۲۸ــ حافظ محمد نظام الدین صاحب ۔
۲۹ــ مولوی محمد امانت اللہ صاحب ۔
۳۰ــ مولوی فضل احمد خان صاحب ۔
۳۱ــ حضرت مولوی امداد علی صاحب ۔
۳۲ــ نواب محمد احمد اللہ خان صاحب ۔
۳۳ــ منشی ذکا اللہ صاحب ۔
۳٤ــ حکیم محمدحکمت اللہ صاحب ۔
۳۵ــ مولوی محمد حامد حسین خان صاحب ۔
۳٦ــ سید محمد احمد خان صاحب ۔
۳۷ــ شیخ محمد فیاض علی صاحب ۔
۳۸ــ میر سید تراب علی صاحب ۔
۳۹ــ مولوی محمد عنایت رسول صاحب ۔
٤۰ــ شیخ خیر الدین صاحب ۔

regret that under the great pressure on pecuniary matter I couid not subscribe more towards this laudable undertaking. I am afraid the Council will be adjourning in the March and it will be too late for you to come then. If you can come even for a few days now I cannot say how glad I will be, but I suppose this will be impossible as you will not be able to leave your Court.

With best regards,

Believe me,
My dear Syed Ahmed Khan Saheb,
Ever yours sincere friend,
R. VIJEANAGUR

[62]

Proceedings of the M. A. O. C. F. Committee

روئیداد

اجلاس ممبران مجلس خزینته البضاعت لتاسیس مدرسة العلوم

منعقده دسویں فروری ۱۸۷۳ء

نمبر ۱۰

صدر انجمن

نواب محمد حسن خان بہادر ۔

ممبران موجوده

مرزا محمد رحمت الله بیگ صاحب ۔

مولوی اشرف حسین خان صاحب ۔

مولوی محمد عارف صاحب ۔

منشی سید علی حسن صاحب ۔

شیخ غلام علی صاحب ۔

سید محمد حامد صاحب ۔

سید محمد محمود صاحب ۔

سرکار میں گذارش کرکے جیسا حکم ہوگا اس سے اطلاع دوں گا - اور باقی حال مفصل کی اطلاع عقب سے آپ کو دیجاویگی - اور مجھے تعمیل ارشاد میں کچھ تامل نہیں ہے - انشا اللہ تعالیٰ نوبت [یاد] دلوانے کی نہ پہونچے گی اور میرا ارادہ ہے کہ میں بمقدمہ چندہ جناب والا جاہ امیرالملک سید محمد صدیق حسن خانصاحب بہادر اور جناب مدارالمہام محمد جمال الدین خانصاحب بہادر نائب الملک محروسہ ریاست بھوپال و دیگر اراکین سے گفتگو کرکے حال مفصل سے اطلاع دوں گا - اور مجھے مدام اپنے خادمان میں سے تصور فرماکر کاروبار لائقہ سے یاد و شاد فرماتے رہئے - اور میری طرف سے بخدمت والا درجت سید محمد محمود خانصاحب سلام و نیاز عرض کر دیجئے - فقط - مورخہ یازدہم ذی قعد ۱۲۸۹ ہجری

۱۲ جنوری ۱۸۷۳ء

عریضہ ساز

کمترین سید حبیب علی ناظم مشرق و مہتمم کل بندوبست پیمایش ہرسہ ضلع ملک محروسہ ریاست بھوپال

[61]

Letter from Raja Vijeanagur to Syed Ahmad Khan

CALCUTTA
TIVOLI GARDEN
29th January/73.

My Dear Syed Ahmed Khan Saheb,

I have duly received your kind letter of the 5th Instant last. Many thanks for thus kindly offering to help me in the Council and to send me an outline of the Bill as I hear the Council will break very early this year. I am afraid we have only six or seven weeks more before us and I should like to propose it in good time as there is no time to lose. Please draw out the out-line of the Bill at your earliest convenience and oblige. I am very glad that the subscriptions have risen to upwards of Rs. 70,000 and I only hope that the full amount what you look to will be realized. In the meantime I have the pleasure to subscribe Rs. 3,000 but I only

[59]

Letter from S. Brooke to Syed Ahmad Khan

JABALPUR
January 10th, 1873

MY DEAR SIR,

I have received your note of the 5th Jan. I fear that my influence with H. H. The Shahjehan Begum of Bhopal has been over-rated, but when I see Her Highness which will perhaps be shortly, I shall not fail to press on her consideration the claims of as worthy an object as the proposed new Mohammedan College. At any rate you may depend upon me to do my best to induce Her Highness to contribute and to further the good work in any other way that lies in my power. To this end I shall be obliged if you send me as a guide and for information as to what has already been done, the list of members up to date.

Wishing you every success and speedy attainment of the goal you have worked out for yourself and with kind regards to your son,

Syed Ahmed Khan
Sub-Judge
Benares

Believe me,
Yours very truly,
S. BROOKE

[60]

Letter from Syed Habib Ali to Syed Ahmad Khan

مخدوم مکرم و معظم جناب سید احمد خانصاحب بہادر سی ایس آئی دام اقبالہ

بعد سلام مسنون واضح رائے عالی ہو۔ کرامت نامہ سامی بعد مدت دراز ورود ہوا۔ بدریافت خیریت مزاج مبارک کمال خوشی ہوئی اور یاد آوری سامی نہایت ممنون ہوا۔ آپ نے بمقدمہ چندہ مدرسہ کے لکھا ہے۔ انشا اللہ تعالیٰ

٦ــ اس مدرسہ کے قائم ہونے میں تخمیناً کتنی مدت درکار ہے ۔

٧ــ کب تک انتظار کرکے اپنے روپیہ کی واپسی اہل اسلام کرسکیں گے ۔ یا کبھی واپس نہ ہوگا ۔ برسوں تک یہی کہا جائے گا کہ صبر کرو انتظار دیکھو ۔

٨ــ جو مدارس بالفعل جاری ہیں ان پر بحالت کم جمع ہونے چندہ کے اور چھوٹا سا اسکول جاری ہونیکے کیا ترجیح مدرسۃ العلوم کو ہوگی فقط ۔

مجھکو اس وقت بلکہ مدت سے سخت افسوس ہے کہ ہماری قوم میں سید احمد خاں صاحب ایک شخص لائق اور نامور اور معزز اور ذی عقل پیدا ہوئے اور ترقی قومی پر آمادہ ہونا ان کا ارادہ ظاہر کیا گیا ۔ مگر اپنی خودرائی سے مذہبی دست اندازی و انقلاب دین ایسا اون کی طبیعت میں جم گیا کہ اصلی غرض فوت ہوگئی اور تمام قوم کو اون سے نفرت پیدا ہوگئی ہے ۔ مجکو بھی جس قدر مخالفت ہے اون کے خیالات مذہبی سے ہے نہ اون کی ذات خاص یا تعلیم علوم جدیدہ سے ــ واللہ علی ماتقول شہید والسلام

نامہ سیاہ ۔ علی بخش عفی عنہ

[58]

Letter from Raja Jaikishan Dass to Syed Ahmad Khan

D/Alligurh the 4th Jany. 1873.

To

MOULVI SYUD AHMED KHAN BAHADUR. C.S. I.

Benaras

DEAR SIR,

In reply to your letter of the 15th ultimo, I have the pleasure to inform you that Mr. Lawrence, the Collector, Dr. Jackson, the Civil Surgeon, Mr. Hunt, the Executive Engineer as well as Mohomed Inayat Ulla Khan and Moulvi Mohomed Yoosuff have all agreed to act as members of the special committee for the selection of a suitable site at Allygurh for the Muhammadan College. And as for myself, I very thankfully accept the membership of the Committee.

I remain,

Yours truly,
RAJA JAIKISHUN DASS

معصیت ہے ، ہاں سید محمود صاحب کی تقریر سے میرا جی خوش ہوا اور وہ کسی قدر پابند دینیات کے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ میں نے سنا ہے لندن میں نماز عید پڑھی اور روزے بھی رکھے۔ اور سوائے ایک لفظ سخت کے اون کی تقریر میں سختی بھی کم دیکھنے میں آئی۔ گو ان کی رائے کسی قدر مخالف اہل اسلام ہو مگر وہ دوسری بات ہے۔ مدرسہ کے باب میں رائے اچھی لکھی ہے۔ سید صاحب آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں سید احمد خاں صاحب کا ہر بات میں مخالف ہوں ، ہرگز نہیں۔ میرے نزدیک امور دنیوی میں جس قدر ترویج علوم جدیدہ میں وہ ساعی ہوتے ہیں بظاہر مجکو اچھا معلوم ہوتا ہے ، ہاں ابتدا میں جو وضع طالب علموں کی اور اصلاح کتب دینی کی اون کی رائے میں دیکھی تھی تو مجکو بڑا خطرہ پیدا ہوا تھا۔ اب تو کچھ دوسرا ڈھنگ سید محمود والا چاہتے ہیں۔ جس سے امید ہے کہ فریب اندازی عقاید اسلام و کتب ہذا میں نہ ہوگی۔ اب میں اپنے شبہات بیان کرکے آپ سے رائے لینا چاہتا ہوں ، جلد جواب دیجئیے۔

۱ــ اس مدرسہ کے واسطے لاکھوں روپیہ چاہیے جس کی امید نہیں ہے۔ پھر اگر اوس قدر سرمایہ جمع نہ ہوا تو ہمارا روپیہ کیا ہوگا۔

۲ــ واقع میں بعد جمع ہونے چندہ اور قیام مدرسہ کے تہذیب الاخلاق کے خیالات کی تعلیم تو نہ ہونے لگے گی۔ کمیٹی ایک ہی جلسہ میں سب کچھ کر دکھانے پر تو آمادہ نہ ہوجائے گی۔

۳ــ پوشاک لباس ایک دوسری وضع طلبائے مسلمیں کا بدلا جائے گا یا نہیں اور کس قسم کا ہوگا۔

٤ــ اگر خاص درجہ تعلیم کتب دینی کے واسطے روپیہ دیا جائے تو وہ اس شرط خاص کے ساتھ منظور ہو کر تعمیل شرط ہوگی یا نہیں۔

٥ــ علمائے مسلمین واسطے تعلیم کے کس قسم کے لوگ منتخب کئے جائیں گے۔ وہ ہی مشرقی تعلیم یافتہ جن کی توہین سے تہذیب الاخلاق بھرا ہوا ہے یا کسی دوسری قسم کے۔

ہے - کیونکہ مجمل تحریر سے آپ کا شبہ شاید رفع نہ ہوگا - چونکہ مجکو یہ منظور نہیں ہے کہ مباحث کلامیہ جدیدہ میں علی بخش ایک طرف اور مولوی مہدی علی صاحب طرف ثانی قرار پاکر لوگ ہنسیں اور خوش ہوں - لہذا آپ کی مرضی ہو تو ایک چھوٹا سا رسالہ اس تمہید سے لکھدوں کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے چار سوال کئے ہیں جن کا یہ جواب ہے تاکہ اوروں کو بھی اس سے فائدہ ہووے - اور اگر محض تقریر کافی ہو تو کسی خط میں لکھ بھیجوں - آپ اٹاوہ ہو آئے ہوں گے - خط مفصل معہ رسالہ بھیجنے کا وعدہ وفا کیجیے - اب میں ایک اپنے دل کی بات آپ سے بعد مدت ظاہر کرکے مشورہ چاہتا ہوں - وہ یہ ہے کہ مدرستہ العلوم کے باب میں انواع و اقسام کی رائیں میری نظر سے گذرتے جاتے ہیں مگر میں نے اپنی رائے اس وقت تک اس خاص امر میں نہیں ظاہر کی ہے - اب کہ سید محمود صاحب کی رائے میں نے دیکھی تو وہ شبہ کسی قدر رفع ہوا کہ غالباً ہماری مذہبی کتابوں میں اصلاح کی نہ ٹھہرے گی اور دینیات میں شائد دست اندازی ہوکر ملت نیچریہ کی تعلیم نہ ہوگی - چونکہ میں اس قدر امر میں سید احمد خاں صاحب سے مخالف نہیں ہوں کہ ہماری قوم کو علوم جدیدہ کی تحصیل ضرور ہے اور تعلیم موجودہ غیر کافی ہے - صدرئ میبذی شرح چغمنی وغیرہ کتب معقولات سے اب کام نہیں چلتا ہے - لہذا اگر کوئی مدرسہ ایسا قائم ہو کہ اوس میں علوم جدیدہ انگریزی سے ترجمہ ہوکر پڑھائے جاویں تو ہمدردی قومی کا پورا نتیجہ نکلے گا - مگر پھر بھی تحصیل فقہ و حدیث و تفسیر میں ہرگز خلل نہ آنے پائے - مگر چند امور ابھی میرے جی میں کھٹکتے ہیں - جس سے میں خود بھی چندہ دینے سے باز رہا ہوں اور اپنے احباب سے بھی فرمائش کرنے سے معذور رہا تھا - اگر آپ محض محبت کی نظر سے سچ سچ اصلی حالات سے میری خاطر جمع کردیں تو خوب ہو - اور وجہ زیادہ تر شبہ کی یہ ہوئی کہ وہ ہی شبہات شاہ کریم الدین صاحب نے سید احمد خاں صاحب سے پوچھے تھے - انہوں نے یہ جواب دیا کہ کمیٹی کی رائے پر منحصر ہے - اس سے سب کو اور بھی شبہ بڑھ گیا کہ اگر خدا نخواستہ کمیٹی نے وہ ہی رائے دی جس کو ہم لوگ خلل انداز دین سمجھتے ہیں تو ایسے مدرسہ میں روپیہ خراب کرنا

واقف ہیں لیکن تاہم بہت سے آدمی اون کے خیالات نیک کو روک دیتے ہیں۔ ہرچند حضور کی ذات مستغنی ہے لیکن اگر مناسب ہو تو کبھی کبھی منشی صاحب مالک مطبع کو بہ ترسیل والا نامہجات معتقد بنائے رکھئے۔ اور اگر کبھی مناسب ہو تو لکھئے کہ مخالف ہمارا کچھہ نقصان نہیں کرسکتے مگر دوستوں کو چاہیئے کہ وہ دوستی میں راسخ دم رہیں اور ہمیشہ تائید مناسب کرتے رہیں ورنہ ہٹ دھرم اور حاسدوں کا کیا ہے وہ تو ہمیشہ برسر پرخاش ہی رہا کرتے ہیں۔

منشی صاحب حضور کے خط سے جو تہذیب الاخلاق کے مفت دینے کی بابت تھا بہت مشکور تھے اور بذریعہ تحریر شکریہ خط لکھنے والے تھے مگر کانپور جانے سے گم صم ہوگئے۔ اب فرماتے ہیں کہ جناب مولانا کو لکھا جاوے کہ ہم کو تہذیب الاخلاق کا نقصان منظور نہیں اسواسطے ہم اوسکو قیمتاً ہی لیں گے۔ چنانچہ بعد حصول جواب قیمت ابلاغ ہوگی۔ امید کہ جواب سے جلد معزز فرمایا جاؤں۔ زیادہ حد ادب۔ بعد ملاحظہ یہ خط چاک فرمایا جائے۔

کمترین اڈیٹر اودھ اخبار

پنجابی اخبار میں تصویر کی بابت جو خط چھپا ہے اوسکو پڑھکر نہایت طبیعت خوش ہوئی۔ اللہ تعالے آپ کو سلامت باکرامت رکھے۔

[57]

Letter from Maulana Ali Bukhsh to Syed Mahdi Ali

سیدنا و مولانا تسلیم۔

آپ کا دوسرا خط دیکھہ کر مجھکو بے اختیار ہنسی آئی، خدا تمہاری جان سلامت رکھے۔ مجھکو سید صاحب جناب کے خیالات سے قطع اُمید ہوئی تھی آپ نے پھر قائم کردی۔ خدا کرے اس کا ظہور ہوجائے، لو اب سچ تو کہو سبعہ احرف وغیرہ میں واقعی آپ کو خلجان ہے اور مجھہ سے سچ مچ خدا کے یہاں شکوہ کروگے یا محض تفنن طبع شوخی تحریر و مذاق عادی ہے۔ اگر شق اول صحیح ہے تو اوس کا جواب آخر کسی قدر بطویل و تفصیل چاہتا

[56]

Letter from Editor Oudh Akhbar to Syed Ahmad Khan

جناب عالی دام اقباله ـ

عرصه سے کوئی عریضه لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا معاف فرمائیے گا ـ مضمون تہذیب الاخلاق زیب اخبار ہوا مگر دو تین اخباروں میں مخالفوں کی شورش ہنوز کم نہیں ہوئی ـ اس ہفته میں منشی صاحب کانپور تشریف لے گئے تھے ـ ڈپٹی صاحب بہادر نے ان کو خوب دھمکایا که تم نے ایک کرسٹان اڈیٹر کو نوکر رکھ کے اپنے اخبار کا (مدرسته العلوم کی تائید میں) ناس کر رکھا ہے ـ تمام مضامین سید احمد خاں صاحب کے اسمیں بھر دیتا ہے ـ چونکه منشی صاحب کا مطبع کانپور میں ہے اس واسطے اونھوں نے رعایت کے جواب دیئے ـ تاہم وہ بہت لال پیلے ہوے اوز مجکو اور آپ کو اور اکثر اشخاص کو سخت سست کہا ـ افسوس ہے که آجتک تو میں یہی جانتا تھا که یه شخص شاید کسی جوش حمیت ہی پر حضور سے مباحثه کرنے اور برا بھلا کہنے پر مجبور ہے مگر اب معلوم ہوگیا که فقط نفسانیت اور ضد ہے ـ لاحول ولا قوة ایسے بھی مسلمان ہیں ـ ہرچند میرے مکرم مولانا علی بخش خاں بہادر بھی متعصب ہیں مگر ایسے ضدی اور مغلوب الغضب نہیں ـ خدا رحم کرے ـ میری رائے ہے که کسی جلسه میں اس شخص کو ایسی زک دی جائے که آئنده یه شخص اپنی ہٹ دھرمی پر قایل ہوکر مخالفت چھوڑ دے ـ تمام ہندوستان میں میرے نزدیک انہیں حضرت کی اشتعالک ہے ـ آگرہ اخبار انہیں کا بچه ہے ـ میو گزٹ درم ناخریده ہے ـ اور اور ذریات بھی اکثر انہیں کی تحریک سے مخالفت مدرسته العلوم کی اختیار کرتے ہیں ـ حالانکه اونکی مخالفت سے کیا ہوسکتا ہے ـ حضور کو معلوم ہوگا که اودھه اخبار کے اڈیٹر کو کامل آزادی نصیب نہیں ہے ـ اس واسطے اوسکے (یعنے میرے) خیالات کا گلا گھٹتا ہے ـ اور جو مضامین باہر سے آتے ہیں (یعنی آپ کی تعریف کے متعلق) اون کو بھی کبھی چھاپ نے میں ناکامیاب رہتا ہے ـ منشی صاحب تو آپ کے ته دل سے معتقد اور پائگاہ عالی سے بخوبی

[55]

Letter from Khalifa Syed Mohd Hasan to Syed Ahmad Khan

مخدوم و مطاع بندہ جناب مولانا سید احمد خانصاحب بہادر سی ایس آئی زید مجدھم

تسلیم کے بعد نوازشنامہ ٤ دسمبر کا جواب لکھتا ہوں۔ یہ آپ کا فرمانا اس وقت مجکو ملا تھا جبکہ میں نارنول جانیکے قصد سے گاڑی میں سوار بیٹھا تھا۔ سفر میں کام کی کثرت رہی اس واسطے جواب لکھنے سے مقصر رہا۔ معاف فرمائیے۔ نوٹ قیمتی چھہ سو روپیہ بابت چندہ مدرستہ العلوم ارسال ہیں۔ دستور العمل اول خدمت میں بھجوں گا پھر دیگر اصحاب کو دکھلاؤنگا۔ حضرت کیا کیجئے فریقین میں تعصب کا عجیب حال ہے۔ ورنہ ترتیب دستور العمل کوئی بڑی بات نہیں۔ میری دانست میں تو میرے ہم مذہب صرف علیحدہ رہنے کے واسطے بہانہ کرتے ہیں۔ خیر جو کچھہ خدا کو منظور ہے ہوجائے گا اور میں تو نہ سنی ہوکر اس کام کی تائید کرتا ہوں نہ شیعہ ہوکر۔ فقط مسلمان ہوکر تائید کرتا ہوں اور مجھے خوب یقین ہے کہ خواہ مخالف لوگ کچھہ بھی کریں خدا کے فضل سے یہ مدرسہ کسی نہ کسی روز ضرور جاری ہوجاویگا۔ صبر اور استقلال چاہیئے۔ بحمداللہ تعالے، جب آپ سا شخص اس کا بانی ہے تو کیا اندیشہ ہے۔ جناب سید محمود صاحب سلمہ تعالیٰ کی تقریر اخبار میں پڑھکر نہایت خوشی ہوی اور یہ دیکھکر کہ ہائی کورٹ نے ان کو اپنا ایڈوکیٹ منتخب کیا زیادہ تر مسرت ہوی اللھم زد۔ لیکن حضرت میں سید صاحب کے دیدار فرحت آثار سے بجز چند لحظہ کے مستفیض نہ ہوسکا۔ وہ فوٹو گراف جو آپ نے از راہ شفقت عطا فرمایا تھا میری جیب میں سے رات کو ریل میں کہیں گر گیا اب اس کی تلافی آپ کے ہاتھ ہے۔ والسلام۔ المرقوم ٢٩ دسمبر ١٨٧٢ء مقام پٹیالہ عریضتہ الادب

سید محمد حسن

مکرر گذارش ہے نوٹ قیمتی ایک ہزار روپیہ مرسل ہے اس سے میرا اور بھائی صاحب کا چندہ بے باق ہوجاویگا ــ والسلام براہ کرم رسید سے مطلع فرمائیے۔

سید محمد حسن

ہوگر جو کارروائی اوسکی ہوئی ہے کیفیت روئداد منسلکہ عرضداشت ہذہ سے واضح رائے عالم آرائے آپ کے پہونچی ہوگی - بصورت پسندیدگی اوسکی امید ہے کہ درج اخبار تہذیب الاخلاق یا علی گڑھ اخبار کے فرمایا جاوے اور جواب عرضداشت ہذا سے بہت جلد آگاہ فرماکر عزت بخشی جاوے - فقط

۱۰ دسمبر ۱۸۷۲ء

مقام حاجی پور

کمیٹی خازن البضاعت مدرستہ العلوم

امیر حسن سکریٹری انجمن تہذیب صوبۂ بہار

[54]

Letter from C. W. Muir to Syed Ahmed Khan

GOVERNMENT
N. W. PROVINCES

LIEUT. GOVERNOR'S CAMP
Hurdwar 25th November 72

MY DEAR SIR,

I have to acknowledge with thanks the receipt of the copy of the Mahomedan Social Reformer of the 15th of the current month, containing an account of the proceedings of the meeting of the Mahomedan Anglo-Oriental College Fund Committee with reference to the selection of a suitable locality for the establishment of the proposed College.

I remain,
Yours very faithfully,
C. W. MUIR
Private Secretary

SYED AHMED KHAN BAHADOOR C.S.I.

[52]

Letter from Munshi Zakaullah to Syed Ahmad Khan

جناب فیض مآب سلامت

آپ کا محبت نامہ باستفسار مدرستہ العلوم پہونچا - میرے نزدیک علی گڑھ کی جو خوبیاں بیان کی گئیں وہ صرف خیالی ہیں اور نفس الامری نہیں اور اس کا ایسا ہی حال ہے جیسا کہ اس کے نام کا حال ہے کہ اول جز پیارا ہے اور دوسرا جز مکروہ ہے اور معلوم نہیں کہ کیا کیا ہم اس کو پڑھ سکتے ہیں - مگر تمام ممالک مغربی میں کوئی شہر ایسا بھی نہیں کہ اوسکے واسطے یہ خیالی خوبیاں گڑھی جائیں اس واسطے میں متفق الرائے ہوں کہ وہ یہاں اس قصبہ میں قائم ہو - فقط

ذکاء اللہ پروفیسر الہ آباد کالج

[53]

Letter from Amir Hasan to Syed Ahmad Khan

بعالیخدمت محتشم دوران معظم الزماں جناب مولوی سید احمد خانصاحب بہادر سی - ایس - آئی سکریٹری کمیٹی خازن البضاعت دام عنایتہ

نہایت ادب سے تسلیم عرض ہے - قبل اس کے بھی بعد وصول ہونے پارسل کاغذات عنایتی کے ایک عرضداشت بدریافت اس امر کے کہ آیا قبل اس کے بھی اضلاع بہار کے رئیسان اہل اسلام کی خدمات میں طرف سے صدر کمیٹی کے رسالہجات استدعائے امداد کی بھیجی گئیں ہیں یا نہیں بصورت اخر باہتمام اس انجمن کے تقسیم کیا جاوے -

۲ - باوجود گذرنے عرصہ کے اب تک جواب سے اوسکے سرفرازی نہوئی - آخر بعد انتظار کے انجمن تہذیب صوبہ بہار کا ایک جلسہ واسطے اغراض بطور کار روائی متعلق کمیٹی خازن البضاعت کے ۲ شوال ۸۹ ہجری کو منعقد

کیا جائے نہ دیگر علوم فلسفیہ میں تو لیا جائے گا اور اس کے موافق عمل ہوتا رہے گا یا نہیں۔

سویم۔ اگر اہل اسلام کے یہ خواہش کرین کہ ہمارے لڑکے وضع لباس و اکل شرب میں پابند اول شرائط کے نہ ہوں جن کا ذکر تہذیب الاخلاق میں ہے مگر ایسا لباس بھی نہ پہنیں جو بد وضع پر دلالت کرتا ہو اور میلے کچیلے بھی نہ رہیں اور کھانا بھی اپنی وضع قدیمہ پر کھائیں نہ چھری کانٹے وغیرہ سے تو منظور کئے جائینگے یا نہیں۔

چہارم۔ اگر خدا نخواستہ مدرسہ جاری نہ ہو یا بعد اجرا اوس میں کچھہ قیود واقع ہوں تو جن لوگوں نے چندہ دیا ہے اوسکے واپسی کا کیا ارادہ ہے۔ فرض کیا جائے کہ مکانات کی تعمیر میں کئی لاکھہ روپیہ صرف ہوگیا اور آخر کار مدرسہ نہ چلا تو زر چندہ کیا ہوگا اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔

پنجم۔ علماء جو واسطے تعلیم کے منتخب کئے جائیں گے وہ مخصوص چندہ دینے والوں اور ان کے ورثاء کی رائے پر ہوں گے یا رضامندی اکثر اہل اسلام کے کسی طریقۂ خاص سے کرائے جائینگے۔

ششم۔ اگر اہل اسلام یہ چاہیں کہ مجسم تصویریں مدرسہ میں نہ لگائی جائیں تو یہ شرط منظور ہوسکتی ہے یا نہیں۔

ہفتم۔ اس باب میں کیا اطمینان کرلیا گیا ہے جو طالب علم اس مدرسہ کا اعلے درجہ تک تعلیم پاکر فارغ ہوجائے تو وہ گورنمنٹ سے کسی خاص عہدے یا اعزاز کا مستحق ہوجائے گا۔

ہشتم۔ کوئی درجہ تعلیم قانونی کا اس مدرسہ میں ہوگا یا نہیں اور اس تعلیم کا ڈپلومہ کافی سمجھا جائے گا یا پھر امتحان دینا پڑے گا۔

ہر دفعہ کا جواب تفصیلی براہ عنایت تحریر فرمائیے فقط

الراقم الآثم
شاہ رکن الدین ڈپٹی انسپکٹر مدارس
ضلع گورکھپور
۱۸ نومبر ۱۸۷۲ء

[51]

Letter from Shah Ruknuddin to Syed Ahmad Khan

سید مولانا دام مجدہ، - تسلیم

مدرسۃ العلوم کے متعلق آپ سے بطور خود امور دریافت کرنا چاہتا ہوں اگر طبیعت اچھی ہو اور کچھ تکلیف نہ ہو تو جواب عنایت فرمائیے -

اول - انتخاب کتب دینیہ کا کس طریق پر ہوگا - آیا مثلاً منجملہ صحاح ستہ کے صحیحین تمام و کمال پڑھائی جائینگی یا اصل کتابیں چھوڑ کر مشکوۃ شریف خواہ مشارق الانوار یا جمع بین الصحیحین یا جامع الاصول اختیار کیجائے گی اور نسخہ اول کتابوں کا بدستور رہے گا - چھانٹ چھونٹ کچھ اوس میں نکی جائیگی یا یہ طریقہ نکلے گا ایک مجموعہ تفسیر قران کا ہوگا جس میں اقوال متعدد تفاسیر میں سے منتخب کرلیے جائینگے یا نئی تفسیر بنائی جائیگی - علی ہذالقیاس احادیث کا انتخاب ہوکر ایک مجموعہ علم حدیث کا ہوگا - اسی طرح اصول علم تفسیر و حدیث و فقہ منتخب کیا جاے گا اور اس کا نام مجموعہ اصول ہوگا اور کتب فقہ کس طریق پر پڑھائی جائنگی - کوئی کتاب مثلاً در مختار و طحطاوی و شامی اختیار کی جائیں گی یا منجملہ مسائل فقہ کے کچھ مسائل چھانٹ لئے جائینگے اور اس کا نام مجموعہ فقہ ہوگا - بہرکیف جو انتخاب کتب فقہ کا ہوگا وہ چاروں ائمہ کے مذہب کا مجموعہ واحد ہوگا یا علیحدہ علیحدہ یا کسی کے موافق نہوگا اور عقائد اہل اسلام کا طریقہ تعلیم کیا ہوگا - آیا یہی کہ مثلاً شرح عقائد نسفی یا شرح مواقف پڑھائی جائے گی یا عقائد کا بھی امتحان کیا جائے گا جس کا نام مجموعۂ عقائد ہوگا اور اگر کسی طالب علم کی یہ خواہش ہو کہ علاوہ کتب دینیات مروجۂ مدرسہ کے تکمیل پوری علم حدیث و تفسیر و اصول و فقہ کی کرے تو ایسی تعلیم کا امتناع ہوگا یا مجاز رہے گا -

دویم - اگر کوئی مسلمان اس شرط سے چندہ دے کہ ہمارا روپیہ صرف مثلاً درجہ حفاظ قرآن یا حدیث و تفسیر و فقہ واصول بالتخیص پر صرف

[50]

Letter from Amir Hasan to Syed Ahmad Khan

امیرحسن سکریٹری انجمن تہذیب صوبہ بہار—واقع ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۷۲ء

از مقام قیام حال حاجی‌پور ضلع ترہت

بعالیجناب خجسۃ القاب آفتاب ہند مستغنی عن‌المحامد

مولوی سید احمد خانصاحب بہادر سی ایس آئی سکریٹری کمیٹی خازن البضاعتہ مدرسۃ‌العلوم مسلمانان ہند ایداللہ بالدوام والاستحکام

اخبارات کے دیکھنے سے انجمن تہذیب صوبہ بہار تمام‌تر آپ کی واولعزم کمیٹی کی فیاض منشاؤں اور سراپا رفاہ ارادوں سے کلیۃً متفق ہوکر امید کرتی ہے کہ اگر کمیٹی خازن‌البضاعت جیسا کہ دریائے ذخار کو خس و خاشاک سے گریز اور چمن سرسبز اور شاداب کو خاربند سے عار نہیں اس کو قابل امداد تصور فرما کے کاغذات متعلقہ کمیٹی از ابتدائے تا این دم یکبارگی عنایت فرمادے تو یہ انجمن تمام بعد معائنہ ضوابط اور اطلاع حالات ضروریہ کو جہاں تک ممکن ہوسکے امداد و عمل مین لاوی - گرچہ اس انجمن عظیم‌المقاصد کا سرمایہ خاص چنداں معتدبہ نہیں ہے کہ جس سے امداد کافی کی صورت ہو تاہم بمقتضائے ہمدردی اور رفاہ قومی کے حسب لیاقت عاجزانہ اپنے قبل خریداری یوسف کی اس انجمن نے کمیٹی کی شرکت اپنے ذمہ واجبات سے کرلیا ہے اور اس انجمن کی دلی آرزو ہے کہ آیندہ کمیٹی خازن البضاعتہ ہر ایک امور کی مشورت اور عنایت کواعذ رویداد سے عزت اور افتخار بخشے - کمیٹی خازن البضاعتہ سین‌ٹیفک سوسیٹی بہار اور اسکی برنچ سوسیٹوں اور بڑے بڑے دولت مندان اہل اسلام صوبہ بہار کے نام بامید امدادکے کاغذات کو بھیجنا پسند کرتے ہیں یا نہیں - انجمن متوقع دریافت ہے کیونکہ بوجہ عدم ظہور اس امر کے مقاصد عالیہ پر اس کمیٹی کے بجز اشخاص اخبار بینوں کے علی‌العموم اس صوبہ بہار کے امراء و روساء ذی ہمت اور دولت مطلع نہیں ہیں ورنہ ممکن نہیں کہ ایسے امر عظیم الشان کثیرالمنفعت کے استحکام اور امداد سے قاصر رہتے - فقط اس کمیٹی عظیم‌الشان کا ایک ادنی خیرخواہ - امیر حسن سکریٹری انجمن تہذیب صوبہ بہار -

(بصورت منظوری استدعا ہے کہ اس پرچہ کے درج اخبار کمیٹی ہونے کی ضرورت ہے) -

immunity in previous visitations of Cholera, and this fact testifies to the general salubrity of the place.

The well-water, an element on which the inhabitants lay so much stress, and with just cause, is of the best quality filtering through a porous, sandy soil, and containing but a small proportion of lime salts. The water is soft, plentiful and procurable at an uniform depth of about 20 feet from the surface.

There are no very extensive jheels in the neighbourhood, and near the Station the drainage is tolerably good; but there is room for improvemnt in this respect.

If it shall be decided that the College is to be built at Allygurh, I would recommend that a Committee consisting of the Magistrate, Civil Engineer and Civil Surgeon be convened to act in concert with a Committee selected by the Native gentlemen concerned, to fix on a proper site, after careful inspection of the most eligible sites near Coel, due regard being paid to natural drainage, the vicinity of marshes, railway embankments, prevailing winds and other local peculiarities bearing on the question of health.

Allygurh
18th October 1872

JAMES R. JACKSON M. D.
Offg. Civil Surgeon

[49]

Letter from Moulvi Mushtaq Husain to Syed Ahmad Khan

جناب قبلہ و کعبہ ام سلامت - تسلیم

سند ممبری مجلس خزانۃ البضاعۃ پہونچی، سر پر رکھا آنکھوں سے لگایا سینہ سے چپٹایا اور بڑی عاجزی کے ساتھ جناب باری میں اس کام کے حسن انجام کے واسطے دعا کی - خدا جو گنہگاروں کی بھی سن لیتا ہے اوسکو قبول کرے اور کرے گا -

آپکے رسالہ کا منتظر ہوں - کوئی اور خط سید محمد محمود صاحب کا ملا یا نہیں - نومبر میں آنا قرار پایا یا دسمبر میں - والتسلیم -

خاکسار مشتاق حسین عفی عنہ

از علی گڑھ ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ع

صورت آپ کو پسند نہ ہو اور آپ کو یہی منظور ہو کہ محمڈن انیگلو اورینٹل کالج ہی کو عطا فرماویں تب بھی مجکو مطلع فرماویں کہ میں آدمی بھیجکر اوسکے منگانے کا اہتمام کروں۔ مگر اس حالت میں یہ بات اور آپ کو کرنی ہوگی کہ آپ کمیٹی کو اجازت اور اختیار دیں کہ اگر سر دست اوس سے کوئی کاربراری ہوتے نہ دیکھے تو اوسکو فروخت کرکے روپیہ محڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ میں جمع کردے ۔ زیادہ والسلام فقط ۔

رقیمہ

سید احمد خان از بنارس

مورخہ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ع

[48]

Memo of Dr. James R. Jackson

My opinion has been asked as to the eligibility of Allygurh as a site for the new Mohamedan College.

My experience only extends over a period of less than two years; but this again is supplemented by that of my predecessors, Doctors Clark and Kilkelly. I have no hesitation in asserting on my own judgement, corroborated by the authority of these gentlemen that Allygurh is one of the healthiest Stations of the North-Western Provinces. It is particularly free from Malarial disease, especially that low form of fever, which has of late ravaged the Saharunpore, Muzuffer Nugur and Meerut Districts.

Being situated on the line of railway it is of course liable to epidemic visitation. Lately Cholera and Dengue made their appearance in the city of Coel; but the former of these diseases at any rate did not assume the virulent form which so generally prevailed in so many of the other towns of the North-West. Coel enjoyed a similar comparative

عطا فرمایا ہے اس کا شکریہ - میں آپ کو پہلے انگریزی خطوں میں لکھ چکا ہوں اور پھر اب اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور عنقریب اوسکے منگانے کا بندوبست کرکے میں آپ کو اطلاع دونگا مگر ایک بات اس سے بھی زیادہ مفید میرے خیال میں آئی ہے اور مجھکو یقین ہے کہ آپ بھی پسند کریں گے اور اس کو منظور کریں گے - آپ اس بات پر خیال فرماویں کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے کھلنے میں ابھی کسی قدر توقف ہے کیونکہ جب تک اس کا کافی سرمایہ بذریعہ چندہ جمع نہولے گا اس وقت تک وہ کھولا نہیں جاویگا - اس صورت میں جس قدر اسباب چھاپہ خانہ آپ کے پاس سے آویگا وہ ایک مکان میں بند رہے گا اور کچھ کام میں نہ آوے گا - میری رائے میں نہایت مناسب ہے کہ آپ اس چھاپہ خانہ کو علی گڑہ سین ٹیفک سوسیٹی کو عطا فرمادین - اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم علی گڑہ کا نام اس طرح پر رکھا دین گے (دی علی گڑہ انسٹیٹوٹ گزٹ اینڈ دی تاجپور پروگرس) اور ایک اشتہار دینگے کہ پروپرائٹر پروگرس پریس نے اپنا پریس سین ٹیفک سوسیٹی علی گڑہ کو بطور ڈونیشن عطا کردیا ہے اور اس لئے ہم نے اپنے اخبار کے ساتھ تاجپور پروگرس کا نام شامل کردیا - اس تجویز میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ تمام اسباب کام میں آوے گا اور عام فائدہ پہونچاویگا اور تاجپور اور پروگرس کا نام بھی ہمیشہ قائم رہے گا - دوسرا فائدہ یہ ہے کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بھی غالباً علی گڑہ میں قائم ہوگا اور اس کا چھاپہ خانہ اور علی گڑہ سین ٹیفک سوسیٹی کا چھاپہ خانہ اور کاروبار سب یک شامل ہوجاویگا - تیسرا فائدہ یہ ہے کہ عنقریب سید محمود تمہارے دوست ولایت سے واپس آنے والے ہیں اور غالباً علی گڑہ اخبار کے کاروبار اور نگرانی انکے متعلق ہوجاویگی اور علی گڑہ کے اخبار کا کاغذ بھی عمدہ کیا جاتا ہے اور اسکی انگریزی ایڈٹیری کا بھی اہتمام شروع سال سے اور طور پر کیا جاویگا - پس اس تجویز سے ہر قسم کا فائدہ حاصل ہوگا - اب اگر آپ کو یہ تدبیر پسند ہو تو فی الفور مجھکو اطلاع دیں کہ میں راجہ جے کشن داس بہادر سکریٹری سوسیٹی کو لکھوں اور وہ چھاپہ خانہ کا اسباب لانیکے واسطے آدمی روانہ کرین جو مذکورہ بالا

[46]

Lctter from M. Kempson to Syed Ahmad Khan

No. 2540 of 1872 - 73

To

M. SYUD AHMED KHAN Br.
SUB-JUDGE *Benares*.

Sir,

With reference to your note of the 26th September last, I beg to reply that the promise made by me to purchase copy of the Report of your Mahomedan Committee at Benares on the subject of Education was conditional on the sanction of the Lieutenant Governor, whose orders on the subject have not yet been received.

On my own part, now that I have carefully examined the contents, 1 may add that I do not think it will be an addition to school Libraries in general.

I enclose a money order for Rs. 5, price of the copy I received, and if there is any thing owing for postage, I will remit the amount on receiving information of what is due.

Yours truly,
M. Kempson
14-10-72

[47]

Letter From Syed Ahmad Khan to Juggut Singh

کنور صاحب عزیز و شفیق من سلمہٗ اللہ تعالےٰ

بعد دعائے ترقی عمر و دولت واضح ہو کہ آپ کا محبت نامہ مورخہ ۲ اکتوبر ۱۸۷۲ء بمقام علیگڑھ میرے پاس پہنچا - کیونکہ میں سفر میں تھا اسلئے جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی - اب میں بنارس میں واپس آگیا ہوں اسلئے جواب لکھتا ہوں - آپ نے جو چھاپہ خانہ پزوگرس کا محمدن اینگلو اورنٹیل کالج کو

مدرسہ پر اس کو موقوف نہ رکھا جاوے اور میری دانست میں بہتر ہوگا کہ معتبر معتبر علمائے لکھنؤ سے بھی اونکی تعلیم کا طریقہ دریافت ہوکر اور جہاں تک کہ اصول اور مقاصد کمیٹی کے مخالف نہ ہو قبول کیا جاکر مشتہر کر دیا جاوے کہ اس صورت میں دونوں فرقہ مطمئن ہوکر اس مدرسہ کے قائم کرنے میں ساعی ہوجاویں گے اور اختلاف کا شبہہ جسکی میرے نزدیک کوئی اصل نہیں ہے رفع ہوجاویگا - میری یہ بھی راے ہے کہ اس طرح کی باتیں جیسی شیعہ لکھنؤ نے ظاہر کی ہیں ضرور ہے کہ کمیٹی اون پر ہمیشہ توجہ کرے اور عموماً ایسے اعتراضات اور شبہات کمیٹی کے معمولی اجلاسوں میں پیش ہوکر جہاں تک ممکن ہو اونکی اصلاح کی جاوے -

آپ کی عرض داشت نام نامی سری حضور دام اقبالہ معرفت سکریٹری گورنمنٹ سرشتہ میں تو پہنچ گئی ہے - انشا اللہ تعالیٰ بہ وقت مناسب پیش کی جاوے گی اور آپ کا منشا جو درباب تقرر سالنامہ یا ماہانہ کے ہے مدنظر رکھا جاوے گا - والسلام - المرقوم ۷ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ء

عریضہ الادب

سید محمد حسن

آپ کی اطلاع کے واسطے لکھتا ہوں کہ ہمارے سری حضور دام اقبالہ نے اہل پنجاب کے واسطے ایک سول سروس اسکالر شپ قائم کیا ہے - کیا خوب ہو اگر صوبجات کے رئیس بھی ایسا ہی کریں - اسکی شرایط پٹیالہ اخبار میں مفصل مشتہر کی گئی ہیں -

---

[45]

Letter from Khalifa Syed Mohd Hasan to Syed Ahmad Khan

جناب مخدوم مکرم مطاع معظم جناب مولوی سید احمد خانصاحب بہادر
سی ۔ ایس ۔ آئی زاد مجدکم

تسلیم ۔ معلوم نہیں اب بھی آپ شرکت دربار انبالہ کے واسطے تشریف لاوینگے یا نہین کیونکہ سٹار آف انڈیا کا دربار تو بمبئی میں ہوگا ۔ ترجمہ کتاب اقوم المسالک کی نسبت آپ نے کچھہ تحریر نہیں فرمایا ۔ امیدوار ہوں کہ اوسکی کیفیت سے مفصل آگہی بخشی جاوے ۔ پنجابی اخبار مطبوعہ ۲۸ ستمبر میں ایک خط حضرات شیعہ لکھنو کی طرف سے اس استدعا سے چھپا ہے کہ اون کو مفصل آگاہ کیا جاوے کہ ان کی تعلیم کا طریقہ مدرسۃالعلوم میں کیا ہوگا ۔ چنانچہ میں اس پرچہ کو خدمت شریف میں اس غرض سے بھیجتا ہوں کہ آپ کمیٹی میں تحریک کریں تاکہ کمیٹی کی جانب سے آپ فرقہ شیعہ کی تعلیم کا طریقہ مشتہر فرماویں ۔ گو اس کا قرار دینا اور مشتہر کرتا جب تک مدرسہ قائم نہ ہوجاوے قبل از وقت ہے ۔ لیکن میری دانست میں باتفاق رائے صائب اخبار مذکور واسطے رفع شبہات اس فرقے کا اور اس غرض سے کہ وہ بدل و جان اس کی شرکت کو قبول کریں اور اسکے قائم کرنے میں ساعی ہوجاویں بہت ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو طریقہ تعلیم کے مشتہر کرنے میں عجلت کی جاوے ۔ ہرچند آپ کے خطوط مطبوعہ پٹیالہ اخبار و پنجابی اخبار میں مفصل مندرج ہیں کہ شیعہ سنی کا طریقہ تعلیم جدا جدا ہوگا اور ایک فرقہ کے علماء اس کو تحریر کریں گے اور مدرس بھی دونوں فرقوں کے علیحدہ علیحدہ ہوں گے ۔ لیکن اس سبب سے کہ یہ خطوط حسب ضابطہ کمیٹی کی طرف سے نہیں سمجھے جاسکتے صرف آپ کی تنہا رائے سمجھی جاتی ہے گو وہ کیسی قدر و قیمت کیوں نہ رکھتی ہو ۔ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ کمیٹی کی طرف سے دونوں فرقوں کا طریقۂ تعلیم مفصل مشتہر کردیا جاوے اور تقرر

[43]

Letter from Captain H. Grey to Syed Ahmad Khan

No. 771 BHAWULPOOR
POLITICAL AGENT'S OFFICE *Dated 30th Septr/72*

Bhawulpoor

To

SYED AHMED KHAN Bhr. C.S.I.
Life Honorary Secretary,
M.A.O.C.F. Committee,
Benares

SIR,

In reply to your letter dated 18th September 1872, I beg to inform you that I will contribute Rs. 2000 to the College on the part of His Highness the Nawab of Bhawulpoor.

The Treasury Officer will remit the money to you on reference.

Yours faithfully,
H. GREY, Captain
Offg. Political Agent & Supdt.

[44]

Letter from Moulvi Mushtaq Husain to Syed Ahmad Khan

جناب قبلہ و کعبہ ام سلامت تسلیم

اترولی سے مولوی سید فضل حق صاحب کا جواب آگیا انھوں نے نہایت رغبت کے ساتھ مول لینے دو ثلث کی اجازت دی - اب اس کی تکمیل کرائی جاوے گی اور آپ کے آنے پر سب کام ختم ہوجاوے گا - اطلاعاً عرض ہے، زیادہ حد ادب -

مولوی سید زین العابدین صاحب کو تسلیمات اور یہ کہ علی گڑھ کی آب و ہوا اب پہلے کی بہ نسبت بہت اچھی ہے - موسم بہت ہی دلکش ہوتا جاتا ہے، پس اگر ہوسکے تو علی گڑھ چلے آئیے -

خاکسار

مشتاق حسین عفی عنہ

از علی گڑھ - ۷ اکتوبر سنہ ۱۸۷۲ء

اس ضلع سے جس قدر چندہ پہلے ہوا اور جواب فہرست نمبر ۳ میں مندرج ہے اسمیں سے کوئی رقم پرامیسری نوٹ وغیرہ کی خریداری میں صرف نہ ہوگی جو سود سے متعلق ہو اور آئندہ بھی جب تک کسی رقم کی نسبت خاص ہم یہہ تصریح نہ کردیں کہ یہ پرامیسری نوٹ کی خریداری میں صرف کی جاوے تب تک کوئی رقم اوس کام میں صرف نہ ہوگی - اور یہ درخواست میں نے ارباب انجمن اور شرکاء چندہ کی تحریک اور اتفاق سے کی ہے فقط والتسلیم -

خاکسار

مشتاق حسین سکرٹری انجمن اسلامی علی گڑھ

۲۰ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ ع

[42]

Acknowledgment from the Political Agent, Marwar Agency to Syed Ahmad Khan

MARWAR AGENCY
No. 301 of 1872

To

SYED AHMED KHAN BAHADOOR, C.S.I.
Life Hony. Secy.
M.A.O.C.F. Committee,
Benares

Dt. Camp Aboo 20th Sept. 72

Acknowledges receipt of his letter of 12 Instant and informs him that Political Agent has with pleasure forwarded the Enclosures to the Maharaja of Marwar, the Maharawal of Jeasulmere; and that for the Maharaja of Bikaneer has been transmitted through Captain Burton, Assistant Agent, Governor General, at Bikaneer.

Political Agent

ایک مسودہ اس کا انھوں نے میرے پاس بھیجا ھے - ارسال خدمت کر رھا ھوں - اگر بدانست ارباب کمیٹی ایسی درخواست کسی اور طرح سے مضر نہ ھووے اور مناسب سمجھیں تو تحریر کریں مجھکو بہت امید کاربرآری کی نہیں ھے لیکن مولوی صاحب ممدوح البتہ کسی قدر امید رکھتے ھیں -

زیادہ نیاز

مبلغ ۵۰ روپیہ چندہ ایک شخص حاجی حسن ھندی سوداگر مقیم قسطنطنیہ سے مجھکو وصول ھوا - داخل اخبار فرمائیے - ھمدست سید محمد محمود یا سید جعفر حسین کے ارسال کروں گا - والسلام احمد حسن ملتسمہ ۱۸ ستمبر ۱۸۷۲ء

از قسطنطنیہ

خط بنام نواب محمد اسمعیل خاں حسب نشان ذیل پہونچ سکتا ھے لیکن رجسٹری ضروری ھے -

قسطنطنیہ محلہ غلاطہ بذریعہ حاجی حسن ھندی بملاحظہ
نواب محمد اسمعیل خانصاحب فائزباد

[41]

Letter from Moulvi Mushtaq Husain to Syed Ahmad Khan

بخدمت مولوی سید احمد خانصاحب بہادر سی ایس آئی سکریٹری کمیٹی خازن البضاعۃ سلامت

تسلیم - فہرست نمبر ۲ مورخہ ۲۰ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ ع چندہ مدرسۃ العلوم کی بابت ضلع علی گڑھ کی بھیجی جاتی ھے درج فہرست صدر فرمائی جاوے اور ڈنیگو بخار کیوجہ سے بالفعل کام چندہ کا ملتوی ھے ورنہ یہاں بخوشی تمام ھر ایک مسلمان اس کام میں تھوڑی بہت مدد کرنیکے واسطے تیار ھے - چنانچہ ایسا ھی ظہور میں آویگا انشا اللہ -

بہادر ممدوح ترجمہ کرکے چھپوایا تھا اس کے ساتھہ مرسل ہے ۔ اب میں آپ کو یہ رائے دیتا ہوں کہ مدراس میں بھی جو سواد اعظم اور شایستہ ملک ہے یک رکن مقرر فرمادیں۔ اگر آپ اس رائے کو پسند فرماتے ہیں تو چند اسماء وہاں کے عمائد کے پیش کرتا ہوں آپ کسی ایک کو مقرر کریں ۔ آپ مجھکو رکن مجلس مقرر کرنے کی اطلاع اخبار علی گڈھ میں چھپوادیں تاکہ میں یہاں کے لوگوں کو وہ کاغذ دکھلاکر یقین کامل دلوادوں ۔ خاتمۃ الکلام پر یہ دعا ہے کہ خدائے کریم آپ کی کوشش کا نتیجۂ خیر دے اور آپ کو کامیاب کرے ۔ میر مجلس صدر اور ارکان کو میری طرف سے سلام مسنون پہنچانا ۔ فقط مرقوم

١٤ رجب ١٢٨٩ ھجری ١٨ ستمبر ١٨٧٢ء

حافظ صدر الاسلام

[40]

Letter from Ahmad Hasan to Syed Ahmad Khan

جناب مولوی صاحب مخدوم مکرم مطاع معظم بندہ دام مجدھم

بعد تسلیمات و تمنائے ملازمت گذارش ہے ایک شخص نواب محمد اسمعیل خانصاحب نامی ہیں اور نواب محمود خانصاحب نجیب آبادی جو یہاں وارد ہیں مجھکو ملے ۔ اگرچہ جرم بغاوت میں عہدہ منصفی سہارنپور سے برخاست ہوے اور عندالاپیل بحالی نہ پائی ۔ مگر اب کوئی جرم بغاوت نسبت اون کے نہیں ہے ۔ یہاں کی دولت نے واسطے ان کے گورنمنٹ ہندوستان سے تحریک کی ہے ۔ گورنمنٹ ھند نے چھہ سو روپیہ واسطے راہ خرچ اور ١٥ روپیہ ماھواری آئندہ باجناب منقول کیا لیکن وہ رضامند نہ ہوے اور فکر افزونی میں مقیم ہیں ۔ وہ مجھکو لکھتے ہیں کہ اگر کمیٹی ترقی خواہ تعلیم اھل اسلام ہندوستان اس ملک سے کچھہ مدد چاھے تو میں قوم ترک سے تحریک اور درخواست چندہ کروں ۔ چنانچہ وہ اسم خود تحریر منجانب کمیٹی چاھتے ہیں ۔

[39]

Letter from Hafiz Sadrul Islam to Syed Ahmad Khan

جناب سعادت مآب فضیلت انتساب مولوی سید احمد خانصاحب بہادر
سی - ایس - آئی مدظلکم

اسلام علیکم و علی من لدیکم - التماس یہ ہے کہ محبت نامہ مورخہ ٥ ماہ ستمبر ۱۸۷۲ء پہنچا حقیقت معاملہ سے آگہی ہوئی - اس میں کچھہ شک نہیں کہ تجویز آپ کی درباب تقرر مدرسہ و وصول زر بطور چندہ نہایت مستحسن ہے اور عاصی بھی ہمیشہ اس مدرسہ کے حالات اخبار سین ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ میں دیکھتا تھا اور آپ کی کامیابی کی دعا کرتا تھا - وہ جو آپ عاصی کو ممبر صدر کمیٹی کا بنانا چاہتے ہیں یہ فقط آپ کی عنایت کا سبب ہے ورنہ میں تو اس کے قابل نہیں اور چونکہ اس کام میں اہل اسلام کی ترقی مضمر اور آپ کی خوشنودی متصور ہے میں نے قبول کیا اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں - پچاس جلد رسالہ مرسلہ پہنچے اور تحریر جواب کو فقط انہیں کا انتظار تھا اور یہ بھی سبب تھا کہ درنیولامیری نورچشمی صغیر سن کا انتقال ہوگیا اور اب میں اپنا کام شروع کرتا ہوں اور ایک کمیٹی بھی مقرر کرکے آپ کو ان کے اسماء سے اطلاع دوں گا - در صورت ضرورت آپ انکے اسماء پر خطوط محبت انگیز لکھیں - میں اس رائے صائب پر آپ کی تحسین کرتا ہوں جو یہاں آپ نے تقرر ممبر کیا اور میرا ارادہ یہ ہے کہ یہاں کی مجلس کے میر اور بعضے ارکان یہاں کے عمائد سے ہوں تاکہ یہاں کے ساکنین باعتماد انکے چندہ دینے میں پس و پیش نہ کریں - ہرچند میں جیسا ہوں سو آپ کو بھی معلوم ہوا ہوگا اور ساکنان شہر بھی خوب جانتے ہیں اس پر بھی میں غیر ملک کا رہنے والا ہوں یعنی مدراس کا - اس لیے میر و ارکان مجلس یہاں کے عمائد کو مقرر کرنا چاہتا ہوں - یک رسالہ انگریزی میرے حالات کا آپ کے ملاحظ کیواسطے ملفوف ہے اور یک اسپیچ جو سر ولیم ڈینس صاحب بہادر گورنر سابق مدراس نے مدرسۂ اعظم کے طلباء کے روبرو بیان فرمایا اور اسکو عاصی حسب الحکم